احکامِ ہجرت و جہاد

مولانا سید جلال الدین عمری

مباحث

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ ایک طرف ہر دور میں اس کی صداقت پر ایمان ویقین کا اظہار ہوتا رہا ہے، تو دوسری طرف اس حقیقت سے انکار بھی کیا جاتا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے، اس کی مخالفت بھی ہوتی رہی ہے اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک بڑا اعتراض اس کے تصورِ جہاد پر ہے۔ ایک طویل عرصہ سے یہ ہدفِ تنقید بنا ہوا ہے۔ دورِ جدید میں مختلف وجوہ سے اس میں اضافہ ہوا ہے۔ اسے بربریت اور وحشی پن کی علامت سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کو ایک ایسی جنگ جو اور دہشت گرد قوم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، جس کا وجود ہی خون آشامی اور قتل وغارت گری کے لیے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اہل عرب کے جنگ جو قبائل نے اپنے افلاس اور غربت کو دور کرنے کے لیے خوش حال قوموں پر یورش کی اور لوٹ مار مچائی اور اسے جہاد کا نام دیا گیا۔ یہ باتیں اسلامی تعلیمات سے سراسر ناواقفیت، تعصب اور تنگ ذہنی کا نتیجہ ہیں۔ ان کا جواب بھی دیا جاتا رہا ہے۔ یہ سب کوششیں قابل قدر ہیں۔ ان سے استفادہ ہونا چاہیے۔ میں نے ارادہ کیا کہ جہاد سے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات کو اس طرح مرتب کر دیا جائے کہ ان ہی کے الفاظ میں جہاد کا مفہوم، اس کا مقصد، اس کے شرائط، اصول وآداب اور قواعد وضوابط تفصیل سے سامنے آجائیں اور کوئی پہلو زیر بحث آنے سے نہ رہ جائے۔ اس کے باوجود امکان ہے کہ کسی نص کا حوالہ رہ گیا ہو۔ آئندہ اس کی تلافی کی کوشش ہوگی۔ ان شاء اللہ

بعض اوقات کسی بات کو اس لیے رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ دورِ حاضر کے مرعوب ذہن کی پیداوار ہے۔ سلف کی اسے تائید حاصل نہیں ہے۔ اس لیے جہاں ضرورت محسوس ہوئی، میں نے کتاب وسنت کے نصوص کی تائید میں مستند اہل علم کے حوالے بھی فراہم کیے ہیں۔

ہمارے قابل قدر قدیم مفسرین، محدثین عظام اور فقہائے کرام کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو اس پر ان کے ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ یہ بالکل فطری ہے۔ اب حالات میں غیر معمولی تغیر واقع ہو چکا ہے، اس لیے بعض اوقات ان کی بحثیں لاطائل اور دوراز کار محسوس ہوتی ہیں۔ جہاد کا موضوع بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے نصوصِ قرآن وحدیث کی تفہیم اور ان کے اشارات کی وضاحت جس ژرف نگاہی سے کی ہے اس سے ان کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور موجودہ حالات پر ان کا انطباق آسان ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں ان مباحث کا کہیں اجمال سے اور کہیں تفصیل سے ذکر آیا ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ احکامِ جہاد تین طرح کے ہیں: بعض کی نوعیت عمومی ہے، بعض کا تعلق اسلامی ریاست سے ہے اور بعض غیر اسلامی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ احکام کا یہ فرق پیش نظر رہنا چاہیے، ورنہ خلط مبحث ہوگا اور نوعیتِ جہاد کا تعین نہ ہو سکے گا۔ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

ہجرت اور جہاد سے متعلق یہ مباحث مضامین کی شکل میں سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں شائع ہو چکے تھے۔ ان پر سترہ اٹھارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن ان کی ترتیب وتدوین کی طرف توجہ نہ ہو سکی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع عطا فرمایا ہے۔ میں نے ان پر نظر ثانی کی ہے اور ان میں حذف واضافہ کیا ہے۔ بعض نئے عنوانات کے تحت گفتگو کی ہے۔ اس طرح انہیں کتاب کی صورت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

راقم نے جہاد سے متعلق بعض اہم مسائل پر 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں بحث کی ہے۔ ان میں جہاد اور اس کے احکام، جنگ کے آداب، جنگ میں غیر مسلموں کی شرکت، ذمیوں کے حقوق، ریاستی امور میں ذمیوں کی خدمات، ذمیوں کی عبادت گاہیں، اسلامی ریاست اور بین الاقوامی تعلقات جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ایک مضمون میں غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام کا پس منظر بیان ہوا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

جہاد کے ذیل میں دارالاسلام اور دارالحرب کا سوال بھی اٹھایا جاتا ہے۔ اس عاجز نے 'تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث' میں موجودہ بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں اس پر گفتگو کی ہے۔

پیش نظر کتاب میں ان موضوعات پر یا تو نئے رخ سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، یا ان کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

جہاد پر گفتگو کرتے وقت اسلام کی بعض عمومی تعلیمات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ حقِ حیات انسان کا فطری اور بنیادی حق ہے، جو انسان اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر آتا ہے اس کا حق ہے کہ جب تک اس کی مشیت ہے وہ زندہ رہے۔ اسلام اس کے اس حق کو سلب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں، اگر عدل وانصاف کا تقاضا ہو تو اس کی جان لی جا سکتی ہے۔ (الانعام: ۱۵۱، الاسراء: ۳۳) عدل وانصاف ہر چیز پر مقدم ہے۔ وہ معاشرہ کی اساس ہے۔ اس کے بغیر حقوق پر دست درازی ہونے لگے گی اور امن وامان باقی نہ رہ سکے گا۔ (ملاحظہ ہو: اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان۔ ص ۴۵۔۴۶)

اسلام فساد فی الارض کے سخت خلاف ہے۔ اس لیے کوئی ایسا عمل جس سے زمین میں فساد پھیلے، آزادی فکر وعمل ختم ہو، انسان اپنی صواب دید سے راہ حق پر عمل نہ کر سکے، اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

بعض لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام نے ہمیشہ اپنے دفاع میں جنگ کی ہے۔ اس کی جنگ اقدامی نہیں تھی۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں دفاعی اور اقدامی دونوں طرح کے جہاد کا ثبوت پایا جاتا ہے۔ اس نے ریاست کو اپنے دفاع میں جنگ کا حکم دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اقدامی جہاد کن حالات میں ہوگا۔

ایک ہی موضوع پر متعدد تصانیف ہوں تو قاری کو معلومات کی تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ یہی معاملہ جہاد کے موضوع کا بھی ہے۔ اس پر جب بھی گفتگو ہوگی اس سے متعلق آیات واحادیث اور بسااوقات سلف کی تشریحات زیر بحث آئیں گی۔ یہ ایک طرح کی مجبوری ہے۔ البتہ ان سے جو نتائج اخذ کیے جائیں ان کی اہمیت ہے۔ ان میں رایوں کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کون سی رائے دین کی مجموعی تعلیمات اور اس کی روح سے ہم آہنگ ہے۔

قرآن مجید میں جہاد سے پہلے ہجرت کا ذکر ہے اور عملاً بھی ہجرت کے بعد ہی جہاد ہوا۔ اسی لحاظ سے میں نے موجودہ حالات کے پس منظر میں پہلے ہجرت سے اور اس کے بعد جہاد سے بحث کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور غلطیوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔

جلال الدین عمری
۱۰ر دسمبر ۲۰۱۹

ہجرت اور اس کے احکام

ہجرت اور جہاد

جہاد اسلامی ریاست کا عمل ہے۔ مدینہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو جہاد کے احکام دیے گئے۔ قرآن مجید نے مختلف مناسبتوں سے جہاد سے پہلے ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کی توقع کرتے ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (البقرۃ:۲۱۸)

اس میں ایمان، ہجرت اور جہاد کا ایک ترتیب سے ذکر ہے۔ اسی ترتیب سے اس پر عمل ہوا۔ سورۂ نحل میں ہجرت کا ذکر دو جگہ آیا ہے: ایک جگہ ان اصحاب کی ستائش کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ کے دین کی خاطر ترک وطن کیا اور اس راہ کی شدائد اور تکالیف برداشت کیں۔ ان کی دنیا بھی بہتر ہوگی اور ان کے لیے اجر آخرت تو اس سے فزوں تر ہے:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

جن لوگوں نے اس ظلم کے بعد جو ان پر کیا گیا اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ہم ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانا دیں گے اور اجر آخرت تو بہت بڑا

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (النحل: ۴۱، ۴۲)

ہے، کاش وہ اسے سمجھتے۔ یہ ان کے لیے ہے جنھوں نے صبر کیا اور جو اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ [1]

سورۂ نحل میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل: ۱۱۰)

اس کے بعد بے شک وہ لوگ جنھوں نے ایمان لانے کی وجہ سے تکلیف اٹھائی ہے اس کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا تو یقیناً تمہارا رب اس کے بعد غفور اور رحیم ہے۔

اس میں ہجرتِ حبشہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد مہاجرینِ حبشہ نے مدینہ ہجرت کی اور جہاد میں حصہ لیا، قربانیاں دیں اور صبر واستقامت کا ثبوت دیا۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہے کہ قریشِ مکہ، حرم کی خدمت، اس کی آبادکاری، حاجیوں کے لیے پانی کے انتظام کو بہت بڑی خدمت تصور کرتے ہیں اور اس بنیاد پر کعبۃ اللہ کی تولیت کا سب سے زیادہ حق دار تصور کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد سے ان خدمات کی کوئی نسبت نہیں ہے، دونوں کو ایک درجہ دینا نادانی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور نفوس سے جہاد کیا، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ اس سے بہت بڑا ہے، اور وہی کام یاب ہونے والے ہیں۔ ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور خوش نودی کی بشارت دیتا ہے اور ایسی جنتوں کی جن کی

---

[1] ظاہر ہے، اس میں ذکر اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ہے۔ جلالین میں ہے: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (لاقامة دينه) مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (بالأذى من اهل مكة و هم النبى و أصحابه) ص ۳۵۱۔ بعد میں جب بھی اس طرح کی ہجرت ہوگی وہ بھی اس ثواب کی حق دار قرار پائے گی۔

اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ○

کی نعمتیں ابدی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔ (التوبۃ:۲۰-۲۲)

یہاں بھی ایمان کے بعد ہجرت اور جہاد کا ذکر ہے۔ یہ مراحل اسی ترتیب سے پیش آئے۔ یہ تاریخ بھی ہے اور آئندہ کے لیے لائحۂ عمل بھی۔

سورۂ حج میں راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کے اجر وثواب کا بیان ہے:

وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوۡۤا اَوۡ مَاتُوۡا لَیَرۡزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ○ لَیُدۡخِلَنَّهُمۡ مُّدۡخَلًا یَّرۡضَوۡنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیۡمٌ حَلِیۡمٌ○

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کردیے گئے یا (طبعی موت) مر گئے تو اللہ تعالیٰ ان کو ضرور اچھا رزق دے گا۔ بے شک اللہ ہی بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے۔ بے شک اللہ جاننے والا (دل کا حال) اور بردبار (درگزر کرنے والا) ہے۔ (الحج:۵۸،۵۹)

ہجرت کے وجوب اور عدم وجوب اور ان کے احکام وشرائط پر موجودہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں آئندہ صفحات میں گفتگو کی جائے گی۔ ان شاءاللہ۔



ہجرت ۔ شرائط اور احکام

(موجودہ حالات کے پس منظر میں)

اس وقت دنیا کے نقشے پر دو سو سے زیادہ آزاد ملک ہیں۔ ان میں ساٹھ کے قریب مسلم ممالک ہیں۔ مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں رہتی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی اور ان کے اقتدار اور عدم اقتدار کی ایک تاریخ ہے۔ ان پہلوؤں سے موجودہ ممالک کی تقسیم اس طرح ہوسکتی ہے:

۱- وہ ممالک جہاں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں اور ان کی حکومت ہے۔ ان میں انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی، ایران اور مصر جیسے بڑی آبادی والے ممالک بھی ہیں اور بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات میں شریک ریاستیں اور مالدیپ جیسی چھوٹی ریاستیں بھی ہیں۔ سعودی عرب کو آبادی کے لحاظ سے اوسط درجہ کی ریاست کہا جاسکتا ہے، لیکن بعض دوسرے پہلوؤں سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ 1991ء کے آخر میں روس کے قبضے سے، آذر بائیجان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قزاقستان نے آزادی حاصل کی۔ یہ پانچوں مسلم مملکتیں اپنے محل وقوع، وسیع رقبے، قدرتی وسائل اور مسلم آبادی کے لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

۲- وہ ممالک جہاں مسلمانوں کا اقتدار تھا، اب ختم ہوگیا ہے اور وہ ایک چھوٹی سی اقلیت بن کر رہ گئے ہیں۔ جیسے اسپین۔ اسپین میں اموی خاندان کے ایک فرد

عبدالرحمن الداخل نے ۱۳۸ھ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی اور وہ صدیوں تک اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا مرکز بنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ خانہ جنگی کا شکار ہوگیا، بالآخر عیسائیوں کی سلطنت قائم ہوئی اور تیس (۳۰) لاکھ مسلمان وہاں سے نکال دیے گئے۔ غالباً اب دو تین فی صد مسلمان وہاں رہ گئے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی تشخص، زبان اور تہذیب کو باقی رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔

۳- وہ ممالک جن کے ساتھ مسلمانوں کی قدیم تاریخ وابستہ نہیں ہے، بلکہ ایک صدی یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ سے ان ممالک کو مسلمانوں نے اپنا وطن بنالیا ہے، جیسے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ۔ ان ممالک میں مسلمان حصولِ تعلیم کی خاطر یا ملازمت اور روزگار کی تلاش میں پہنچے، لیکن ان کی خوش حالی، آزادی اور اپنے شہریوں کے لیے فراہم کردہ آسانیوں اور سہولتوں کے پیش نظر وہاں کی شہریت اختیار کرلی اور وہیں رہ بس گئے۔ خود ان ممالک کے باشندوں کا رجحان بھی اسلام کی طرف ہورہا ہے اور اسے وہ قبول بھی کررہے ہیں۔ اس طرح یہ سب مل کر ایک قابلِ لحاظ اقلیت بنتے جارہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ (۶۰) لاکھ سے اسّی (۸۰) لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ اس وقت وہ یہودیوں کے بعد دوسری بڑی اقلیت ہیں۔ مغربی یورپ میں فرانس میں مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ خیال کی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ تیس (۳۰) لاکھ سے پچاس (۵۰) لاکھ تک کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں مسلمانوں کی آبادی تئیس (۲۳) لاکھ ساٹھ (۶۰) ہزار ہے۔ انگلینڈ میں مسلمان بیس (۲۰) لاکھ سے زیادہ ہیں اور اسلام وہاں کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ آسٹریلیا جیسے دور دراز خطّے میں چار لاکھ کے قریب مسلمان ہیں۔

۴- ہندوستان کی نوعیت ان سب سے مختلف ہے۔ یہاں مسلمان اکثریت میں نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں۔ لیکن صدیوں صاحبِ اقتدار رہے ہیں۔ موجودہ

ہندوستان میں مسلم آبادی سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پندرہ کروڑ کے قریب ہے۔ خود مسلمانوں کا اندازہ اس سے زیادہ کا ہے۔ ہندوستان کی صورت حال اور اس کی شرعی حیثیت پر تفصیل سے آئندہ گفتگو ہوگی۔ان شاءاللہ

ان مختلف النوع ممالک کے حالات ایک جیسے نہیں ہیں، اس لیے ان کے احکام ومسائل بھی الگ الگ ہی ہوں گے۔ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ صاحبِ اقتدار ہیں ان کا فرض ہے کہ اُن کا امام یا خلیفہ ہو۔ ان میں پوری طرح اسلامی شریعت نافذ ہو۔ ریاست کی طرف سے دینی تعلیم وتربیت کا انتظام ہو، ملک میں عدل و انصاف قائم ہو، شہریوں کی معاشی کفالت کا نظم ہو، حدود وتعزیرات نافذ ہوں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا نظام قائم ہو۔ ریاست کے سربراہ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی حفاظت کرے اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کرے، دنیا کو اسلام کی طرف دعوت دے، اس کی تبلیغ واشاعت اور اسے سربلند کرنے کی جدوجہد اور تدبیر کرے۔ ان تمام امور میں ریاست کے عوام کا فرض ہے کہ اسے اپنا تعاون فراہم کریں۔

جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان سب کے حالات یکساں نہیں ہیں۔ بعض ممالک میں انھیں شخصی اور عائلی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کی آزادی حاصل ہے۔ وہ دعوت وتبلیغ کی ذمے داری ادا کرسکتے ہیں۔ ان کے لیے اس میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے کہ فکری اور علمی سطح پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کی سعی و جہد کریں۔ ان کے لیے ہجرت کا جواز نہیں ہے۔ ان کی راہ میں وہ دشواریاں نہیں ہیں جن کی وجہ سے ترکِ وطن کرنا پڑتا ہے۔

اس کے برخلاف بعض دوسرے ممالک، خاص طور پر کمیونسٹ ممالک میں مسلمان اقلیتیں سخت بندشوں اور مشکلات کا شکار ہیں۔ ان ملکوں میں مسلمان کھل کر اپنے دین پر عمل نہیں کرپارہے ہیں، دعوت وتبلیغ کے حق سے محروم ہیں، چند احکام دین پر اگر عمل

کر پاتے ہیں تو اپنے دینی اور ملی تشخص اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھنا ان کے لیے دشوار ہے، شعائرِ اسلام کے اظہار پر ظلم وستم کا نشانہ بن رہے ہیں، اس کی ایک نمایاں مثال چین میں ایغور مسلمانوں کی حالت زار ہے۔ انھیں اپنی جان، مال اور عزت وناموس کی حفاظت کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ وہ نہ اپنا ملک چھوڑ سکتے ہیں اور نہ کسی دوسرے ملک کا رخ کر سکتے ہیں، جہاں وہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔[1]

اسلامی ریاست کا قیام اور ہجرت کا وجوب

مکے کے مسلمان اسی طرح کی صورتِ حال سے دو چار تھے۔ مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد انھیں حکم دیا گیا کہ وہ مدینہ ہجرت کر جائیں۔ ہجرت ان کے لیے فرض قرار دی گئی، جن لوگوں نے استعداد اور امکان کے باوجود اس پر عمل نہیں کیا انھیں سخت وعید سنائی گئی:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (النساء:۹۷)

بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، فرشتے جب ان کی جان نکالتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں بے بس اور کم زور تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ (کسی کے) پہنچنے کی بری جگہ ہے۔

آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دار الکفر یعنی مکے میں اسلام لائے اور وہیں رہ گئے، دار الاسلام یعنی مدینہ ہجرت نہیں کی۔ دار الکفر میں قیام کی وجہ سے وہ دین پر عمل نہیں کر پا رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت اور دین کے غلبے کی جدوجہد

---

[1] کمیونسٹ ممالک نظریاتی طور پر مذہب اور خاص طور پر اسلام کے سخت مخالف ہیں۔ وہ کسی قیمت پر اسے گوارا نہیں کر سکتے۔ اب ان میں سے بعض ممالک کی صورتِ حال میں تبدیلی آ رہی ہے اور شخصی اور مذہبی آزادی کے حق کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔

میں شرکت سے محروم تھے۔ وہ خود کو مستضعفین قرار دیتے تھے۔ لیکن قرآن مجید نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ ہجرت کرنے کے موقف میں تھے۔ ان کے لیے ہجرت کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی جس پر وہ قابو نہ پا سکتے ہوں۔ وہ محض اپنی مرضی اور دنیوی مصالح کے تحت مکہ چھوڑنا نہیں چاہ رہے تھے۔

اس آیت کے فوراً بعد حقیقی 'مستضعفین' کا ذکر ہے، جو جسمانی طور پر کم زور یا معذور تھے، یا مالی لحاظ سے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ تھے، یا انھیں جبراً ہجرت سے روک دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں فرمایا:

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (النساء:۹۸،۹۹)	سوائے ان مجبور اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے جو کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں پاتے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو معاف فرما دے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب حالات ٹھیک ہو جائیں اور ہجرت کی صورت نکل آئے تو ان 'مستضعفین' پر بھی ہجرت واجب ہو جائے گی۔

ہجرت کی راہ میں ایک رکاوٹ معاش کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہا گیا کہ اس کے لیے بہت زیادہ فکر مند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جو لوگ اللہ کی خاطر اپنا وطن اور گھر بار چھوڑیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے لیے معاش کی صورتیں بھی پیدا فرما دے گا۔ وہ اس وسیع و عریض دنیا میں اللہ کے فضل و رحمت کے کرشمے دیکھیں گے۔ اگر اس راہ میں جان چلی جائے تو اللہ انھیں ہجرت کے اجر و ثواب سے نوازے گا:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ	جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں (دشمنوں کے علی الرغم) رہنے کی بڑی جگہ اور ہر طرح کی وسعت اور کشادگی پائے گا، جو شخص اللہ کی

يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (النساء:۱۰۰)

طرف ہجرت کر کے نکلے اور پھر (راستہ ہی میں) موت اسے آن پکڑے تو اس کا اجر وثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو گیا۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ایک طرف تو دار الکفر کے مسلمانوں کو دار الاسلام ہجرت کا حکم دیا گیا اور دوسری طرف اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ ان مظلوموں کی مدد کرے۔ انھیں ان علاقوں سے نکالے جہاں ان پر ظلم ہو رہا ہے اور جہاں وہ آزادی سے اسلام کے مطابق عمل نہیں کر پا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہیں کہ ان کے لیے اس ظلم سے نجات کی سبیل پیدا فرما دے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○ (النساء:۷۵)

تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں اور ان مجبور اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو بچانے کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال دے، جس کے باشندے ہم پر ظلم توڑ رہے ہیں اور اپنے پاس سے ہمارا کوئی حمایتی فراہم کر دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کر دے۔

ان سب کوششوں کے بعد بھی جو مسلمان دار الکفر یا دار الحرب میں رہ جائیں ان کے اور دار الہجرت یا دار الاسلام کے مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت تو ہوگی، 'ولایت' کا تعلق نہ ہوگا۔ اس سلسلے کے احکام سورۂ انفال میں بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ جنھوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی (انصار) یہ ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، لیکن ہجرت نہیں کی تو ان سے تمھارا رشتۂ ولایت نہ ہوگا جب تک کہ وہ

حَتّٰی یُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ○	ہجرت نہ کریں۔ہاں اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد طلب کریں تو تمہارے لیے لازم ہے کہ ان کی مدد کرو۔البتہ کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ان کی مدد نہیں کرو گے جس کے اور تمہارے درمیان معاہدۂ امن
(الانفال:۷۲)	ہو۔تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔[۱]

اس سے واضح ہے کہ مہاجرین اور انصار، جو اسلامی ریاست کے شہری ہیں، ان کے درمیان موالات کا رشتہ ہوگا،لیکن جو مسلمان دارالکفر کے شہری ہیں ان سے موالات کا رشتہ نہ ہوگا۔ولایت کے معنی نصرت وحمایت کے ہیں۔اس کا مفہوم وسیع ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دارالاسلام ان کے تحفظ اور نگہ داشت کا ذمے دار نہ ہوگا۔اس میں عملی دشواریاں ہیں۔دونوں ریاستوں کے درمیان وراثت کا تعلق بھی نہ ہوگا۔ ہاں، اگر وہ دینی تقاضے کے تحت مدد طلب کریں تو ضرور ان کی مدد کی جائے گی،لیکن یہ مدد اس قوم کے خلاف نہ ہوگی جس کا دارالاسلام سے معاہدۂ امن ہے۔[۲]

یہ ہیں ہجرت کے احکام اور ان کا پس منظر۔جب مکہ فتح ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرما دیا:

لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الفَتْحِ[۳]	فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

فتحِ مکہ کے بعد ہجرت کا وجوب ختم ہونے کے مختلف وجوہ تھے:ایک یہ کہ اب مکہ دارالکفر نہ رہا، بلکہ دارالاسلام کا حصہ بن گیا۔وہاں سے ہجرت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔[۴]

---

۱ اس کی مزید تفصیل اسی کتاب میں آگے آرہی ہے۔

۲ اس کی مزید تفصیل اسی کتاب میں آگے آرہی ہے۔

۳ بخاری کتاب الجہاد، باب وجوب النفیر وما یجب من الجہاد والنیۃ۔مسلم، کتاب الامارۃ، باب المبایعۃ بعد فتح مکہ علی الاسلام والجہاد الخ

۴ نووی، شرح مسلم: جلد ۷، جزء ۱۳، ص ۷، ۸

اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت دار الاسلام مدینے کو افرادی طاقت کی سخت ضرورت تھی، جو اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ باہر کے مسلمان وہاں پہنچیں، اس کی طاقت میں اضافہ ہو اور دین کی سربلندی کی جو جدوجہد ہو رہی ہے اس میں وہ حصہ لیں۔[1]

اس کی تیسری وجہ یہ تھی کہ مکہ کے مسلمان اہل کفر کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ انھیں دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ ان کی یہ دینی ضرورت تھی کہ وہ مدینہ پہنچ جائیں، جو مرکزِ اسلام تھا اور وہاں رہ کر دین کو اچھی طرح سمجھیں اور آزادی سے اس پر عمل کریں اور ان مصائب وشدائد سے بھی محفوظ رہیں جن میں وہ دار الکفر میں گرفتار تھے۔

فتح مکہ کے بعد صورتِ حال بدل گئی، اس لیے ہجرت باقی نہیں رہی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کا وجوب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، یا جب بھی اور جہاں کہیں بھی اس طرح کے حالات پیش آئیں گے، ہجرت لازم ہو گی؟

فقہ حنفی کی رو سے اب دار الحرب سے دار الاسلام ہجرت کرنا واجب نہیں ہے۔[2]

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۶/ ۱۲۲

[2] سرخسی، المبسوط: ۱/ ۶، فقہ حنفی کا یہی مسلک سمجھا گیا ہے کہ اب دار الحرب سے دار الاسلام ہجرت فرض نہیں ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص حنفی، سورۂ نساء کی آیت (۹۷) کے ذیل میں کہتے ہیں: وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى فَرْضِ الْهِجْرَةِ فِي ذَلِكَ الْوَقْتِ لَوْلَا ذَلِكَ لَمَا ذَمَّهُمْ عَلَى تَرْكِهَا۔ احکام القرآن: ۲/ ۳۱۳ (اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ہجرت اس وقت فرض تھی، اگر فرض نہ ہوتی تو اس کے ترک پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذمت نہ ہوتی) اسی سلسلۂ کلام میں آگے لکھتے ہیں: وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى النَّهْيِ عَنِ الْمُقَامِ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِينَ لِقَوْلِهِ تَعَالَى أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ واسِعَةً فَتُهاجِرُوا فِيها وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى الْخُرُوجِ مِنْ أَرْضِ الشِّرْكِ إِلَى أَيِّ أَرْضٍ كَانَتْ مِنْ أَرْضِ الْإِسْلَامِ ص ۳۱۴۔ (یہ وضاحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مشرکین کے درمیان مسلمان کا قیام منع ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے کہ: ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس کی طرف ہجرت کر جاتے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین کے اقتدار سے نکل کر کسی بھی اسلامی مملکت میں منتقل ہو جانا ضروری ہے) جصاص نے جس عمومی انداز میں گفتگو کی ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ دار الحرب سے دار الاسلام ہجرت کو وہ شاید ہر دور میں ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر اسے فقہ حنفی کی ایک رائے کہا جا سکے تو یہ جمہور علما کی رائے سے ہم آہنگ ہے۔ واللہ اعلم۔

دیگر مذاہب فقہ کے علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ان کے نزدیک دارالحرب سے دارالاسلام ہجرت کوئی وقتی حکم نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ابدی حکم ہے۔اس کی ایک دلیل خود قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس حکم کا کسی خاص دور سے تعلق ہے۔اس کے بعد یہ باقی نہیں رہے گا۔

حافظ ابن کثیرؒ سورۂ نساء کی آیت ۹۷ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ہجرت کے حکم کا تعلق مکہ سے مدینہ ہجرت ہی سے نہیں ہے۔اس کے الفاظ عام ہیں۔اس کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جو مشرکین کے درمیان قیام کی وجہ سے اقامتِ دین پر قادر نہیں ہے۔وہ ہجرت کرنے کے موقف میں ہونے کے باوجود اگر ہجرت نہ کرے تو اپنے اوپر ظلم کرے گا اور حرام کا مرتکب ہوگا۔اس پر اجماع ہے۔آیت صراحتاً اس پر دلالت کرتی ہے۔''[1]

اس کی دوسری دلیل حدیث ہے۔حضرت معاویہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

لَا تَنقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتَّى تَنقَطِعَ التَّوْبَةُ، وَلَا تَنقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا[2]	ہجرت کا سلسلہ منقطع نہ ہوگا جب تک کہ توبہ کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے اور توبہ کا دروازہ بند نہ ہوگا جب تک کہ سورج اپنے مغرب سے نہ طلوع ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کا حکم ابدی ہے۔اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر لا هجرة بعد الفتح کا مفہوم کیا ہے؟

علامہ نوویؒ، علماء کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دارالحرب سے دارالاسلام ہجرت کرنا قیامت تک باقی ہے۔اس حدیث کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ مکہ فتح ہونے کے بعد وہ خود بھی دارالاسلام ہو گیا ہے (اب وہاں سے ہجرت نہ ہوگی اس لیے کہ) ہجرت

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۵۴۲۔

[2] ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت؟ مسند احمد: ۵/ ۶۶

دارالحرب سے ہوتی ہے۔ دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہجرت کی جو خاص فضیلت تھی وہ اب نہیں رہی۔[1]

ابن عربی مالکیؒ کہتے ہیں: ''دارالحرب سے دارالاسلام جو ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں فرض ہوئی وہ قیامت تک باقی ہے اور فرض ہے۔ البتہ فتح مکہ کے بعد وہ ہجرت ختم ہوگئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قیام کے قصد سے کی جاتی تھی۔ اب جو شخص دارالحرب میں اسلام لائے اس کے لیے دارالاسلام ہجرت کرنا واجب ہے۔ دارالحرب میں وہ قیام پذیر رہے گا تو معصیت کا ارتکاب کرے گا۔[2]

ابن قدامہ حنبلیؒ نے پہلے تو ہجرت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

الْخُرُوجُ مِنْ دَارِ الْكُفْرِ إِلَى دَارِ الْإِسْلَامِ.	ہجرت، دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف نکل جانے کا نام ہے۔

اس کے بعد قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت کا حکم قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ عام اہلِ علم کی یہی رائے ہے۔ بعض لوگوں نے لا ھجرۃ بعد الفتح کی بنیاد پر کہا ہے کہ اب ہجرت ختم ہوگئی۔ لیکن ہماری دلیل آیات کا اطلاق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کسی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس پر دلالت کرنے والی حدیثیں بھی ہیں۔ اس کی ہر زمانے میں ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ لا ھجرۃ بعد الفتح کا مفہوم یہ ہے کہ جو شہر فتح ہوکر اسلامی مملکت کا حصہ بن جائے وہاں سے ہجرت نہ ہوگی۔ حضرت صفوانؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت ختم ہوگئی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مکہ سے ہجرت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ ہجرت کفار کی مملکت کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جب اس کا کوئی شہر فتح ہوکر اسلامی مملکت میں شامل ہوگیا تو وہ کفار کی مملکت نہیں رہا۔ اس سے

---

[1] نووی، شرح مسلم: کتاب الحج، ج۵، جزء۹ص ۱۰۴، ۱۰۵

[2] ابن عربی، احکام القرآن: ۱/ ۴۸۴

ہجرت نہ ہوگی، بلکہ اس کی طرف ہجرت ہوگی۔[1]

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک ہجرت، عہدِ رسالت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ایسے حالات کہیں بھی اور کسی بھی زمانے میں پیش آسکتے ہیں، جس میں دین پر قائم رہنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہ رہے۔ جب کبھی کوئی مسلمان ان حالات سے دوچار ہو اور کوئی ایسی مملکت موجود ہو جہاں وہ ہجرت کرسکتا ہو تو اسے ہجرت کر جانی چاہیے۔

اس پوری تفصیل کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا آج کے دور میں جو مسلمان کسی دارالکفر میں پھنسے ہوئے ہیں اور دینی و مذہبی آزادی سے محروم ہیں، ان پر وہاں سے ہجرت لازم قرار پائے گی یا نہیں؟ موجودہ حالات میں بہ ظاہر ان کے لیے ہجرت کو لازم قرار دینا درست نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہجرت اس وقت لازم قرار دی گئی تھی، جب کہ مدینے کی اسلامی ریاست نے دار الکفر کے مسلمانوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے تھے۔ چناں چہ مکے میں بعض وہ مسلمان جو خود کو 'مستضعفین' قرار دے رہے تھے اور ہجرت نہیں کر رہے تھے، قرآن مجید نے ان کے اس عذر کو تسلیم نہیں کیا اور کہا:

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (النساء:۹۷) — کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عملاً ایسا ملک موجود تھا، جہاں وہ ہجرت کرسکتے تھے اور جس کا دامن اُن کے استقبال کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ اس کے باوجود انھوں نے ہجرت اختیار نہیں کی۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ روئے زمین پر صحیح معنیٰ میں کوئی 'دار الاسلام' نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسلم ممالک ہیں، لیکن کسی مسلم ملک میں یہ طاقت

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۳/۱۴۹-۱۵۱

نہیں ہے کہ جو مسلمان ظلم وزیادتی کی چکی میں پس رہے ہیں اور دین پر عمل کی آزادی سے محروم ہیں، انھیں اس سے نجات دلا سکے۔ کوئی دوسرا ملک بھی اس کے لیے فکر مند نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ بین الاقوامی قوانین کے تحت کسی کا اپنا ملک چھوڑنا اور دوسرے ملک کا شہری بننا خاصا پیچیدہ عمل بن گیا ہے۔ اگر کوئی فرد اس کی راہ نکال بھی لے تو پوری قوم کا ترکِ وطن کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ بھی کھلی آنکھوں سے دیکھا جارہا ہے کہ ظلم کے مارے ہوئے کسی گروہ نے اپنے ملک سے پڑوسی ملک میں پناہ لی ہے تو ان کی منتقلی یا ترکِ وطن کو غیر قانونی سمجھا جاتا ہے۔ جس ملک میں اس نے پناہ لی ہے، اس نے اسے قانونی طور پر اپنا شہری تسلیم نہیں کیا ہے۔

ان حالات میں مظلوم مسلمانوں پر ہجرت لازم نہیں قرار دی جاسکتی۔ ان سے یہی کہا جائے گا کہ وہ صبر اور عزم وہمت سے کام لیں اور استقامت کا ثبوت دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا۔ ان کے لیے نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی مکی زندگی ہے۔

دورِ حاضر کا یہ ایک خوش آئند پہلو ہے کہ دنیا میں انسانی حقوق کا اِحساس بڑھ رہا ہے۔ ان کی حفاظت کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ ظلم وجبر کے خلاف کبھی کبھی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کمیونسٹ ممالک میں بھی مذہبی آزادی کا تصوّر ابھر رہا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی اچھی اور خوش گوار تبدیلی کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ جن ممالک میں مسلمان مذہبی آزادی سے محروم ہیں، انھیں اس کی آزادی مل جائے اور وہ کھل کر اسلام پر عمل کرنے لگیں۔

جمہوری ملکوں میں مسلمان اقلیتوں کے حالات اس سے مختلف ہیں۔ امریکہ میں اور یورپ کے ممالک برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں آزادیِ فکر وعمل کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان

اپنے مسلمان ہونے کا برملا اعلان کر سکتے ہیں۔ اس پر عمل کا حق انھیں حاصل ہے۔ ان ممالک میں اسلامی عبادات علانیہ انجام پاتی ہیں۔ جگہ جگہ مساجد موجود ہیں اور نئی مساجد تعمیر ہو رہی ہیں۔ ان میں اذان اور نماز کا نظم ہے، جو دین کا بہت بڑا شعار ہے۔ یہ مساجد دعوتِ اسلام کے مراکز بھی ہیں۔ مسلمانوں کو احکامِ شریعت کے مطابق اپنی نجی اور خاندانی زندگی گزارنے کا حق ہے، دعوت وتبلیغ اور اسلامی خدمات انجام دینے والے ادارے اور تنظیمیں موجود ہیں، مسلمان دینی تعلیم کا نظم کر سکتے ہیں، اسلام پر ریسرچ اور تحقیق کا عمل جاری ہے، بعض اونچے درجے کے مخلص اسکالرس اس میں لگے ہوئے ہیں، قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت ہو رہی ہے۔ کوئی شخص اسلام کو اللہ کا دین باور کرتا ہے تو اسے اس کے قبول کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہے۔

ان ممالک میں اسلام آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے اور سیکڑوں افراد اس کے دائرے میں آتے جارہے ہیں۔ ان ممالک کے مسلمانوں کے لیے اپنا ملک چھوڑنا اور ہجرت کر جانا موجودہ حالات میں درست نہ ہوگا۔ یہ دعوت وتبلیغ کے نقطۂ نظر سے ایک غلط قدم ہوگا۔

علامہ ابن عربی مالکیؒ نے ہجرت کی چھ صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت۔

(۲) آدمی جہاں رہتا ہے وہاں بدعات چھا جائیں اور وہ انھیں بدل نہ سکتا ہو تو اسے چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جانا۔

(۳) آدمی کا اپنے اس علاقہ کو ترک کر دینا جہاں ذرائع معاش پر حرام کا غلبہ ہو۔

(۴) ایسی جگہ چھوڑ دینا جہاں انسان کو اپنی جان کا خطرہ ہو اور اسے سخت جسمانی اذیتیں اٹھانی پڑ رہی ہوں۔

(۵) ایسی جگہ کو چھوڑ کر جہاں صحت وتندرستی نہ رہتی ہو کسی پر فضا اور صحت مند مقام پر چلا جانا۔

(٦) ایسے علاقے کو چھوڑ دینا جہاں انسان کا مال محفوظ نہ ہو۔[۱]

ہجرت کی ان شکلوں میں پہلی شکل کے علاوہ باقی شکلیں وہ ہیں، جن کا اطلاق اسلامی ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی پر بھی ہوتا ہے۔ یہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔ جہاں تک دار الحرب یا دار الکفر سے دار الاسلام ہجرت کا تعلق ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ ہجرت کب واجب ہوتی ہے اور کب اس کا وجوب باقی نہیں رہتا اور کب یہ استحباب کا حکم رکھتی ہے؟

فرماتے ہیں کہ ہجرت اس وقت واجب ہو جاتی ہے جب کہ آدمی ہجرت کرنے کے موقف میں ہو اور ہجرت کر سکتا ہو۔ جہاں وہ رہ رہا ہے وہاں دین کا اظہار و اعلان نہ کر پائے، یا یہ کہا جائے کہ واجباتِ دین کا قیام اس کے لیے ممکن نہ ہو، اس صورت میں کفار کے درمیان رہنے کی اسے اجازت نہ ہوگی۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (اس کا حوالہ مضمون کے آغاز میں موجود ہے)۔

فرماتے ہیں کہ واجباتِ دین کا قیام واجب ہے اور جب ہجرت اس کے لیے واجب ہو جائے تو وہ بھی واجب ہو جائے گی۔ فقہ کا اصول ہے: **ما لا یتمّ الواجب الّا بہٖ فھو واجب** (جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو وہ بھی واجب ہے)۔

ہجرت ان لوگوں پر واجب نہیں ہے جو کسی مرض یا ضعفِ جسمانی کی وجہ سے ہجرت کے موقف میں نہ ہوں، جیسے مریض یا خواتین اور بچے وغیرہ۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی ہجرت واجب نہیں ہے جو دار الکفر میں قیام پر مجبور ہوں اور وہاں سے نکل نہ سکتے ہوں۔ اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے: وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ (النساء: ۷۵)۔

اس طرح کے افراد کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہجرت ان کے لیے

---

[۱] ابن عربی مالکی، احکام القرآن: ۱/ ۴۸۴-۴۸۶۔ ابن عربی نے اس کے ساتھ دینی اور دنیوی مقاصد کے لیے اسفار کی نوعیت بھی بیان کی ہے۔

مستحب ہے، اس لیے کہ ہجرت کا حکم ان کے لیے نہیں ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ مزید فرماتے ہیں کہ ہجرت ان لوگوں کے لیے واجب نہیں ہے جنہیں ہجرت کی قدرت ہو اور وہ ہجرت کر سکتے ہوں، لیکن دار الکفر میں انھیں اپنے دین کے اظہار اور اس کی اقامت کی اجازت ہو، البتہ ہجرت ان کے لیے مستحب ہے، تاکہ وہ اسلامی ریاست میں رہ کر جہاد میں حصہ لے سکیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کی افرادی طاقت میں اضافہ ہو، وہ ان کی مدد کر سکیں، غیر مسلموں کے اختلاط سے بچے رہیں اور انھیں منکرات کو دیکھنا نہ پڑے۔ ہجرت ان کے لیے واجب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دار الکفر میں رہتے ہوئے دین پر قائم رہ سکتے اور واجباتِ دین پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت نعیم النحام کا حوالہ دیا ہے کہ یہ حضرات اسلام لانے کے بعد بھی مکے میں مقیم رہے اور بعد میں ہجرت کی۔[1]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کا شمار قریش کے سرداروں میں ہوتا تھا، دورِ جاہلیت میں مسجدِ حرام کی آبادکاری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے ذمہ دار تھے۔ جنگِ بدر میں مشرکین کے لشکر کے ساتھ آئے اور گرفتار ہو گئے۔ فدیہ دے کر رہائی پائی۔ جنگ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر کسی کا عباس سے سامنا ہو جائے تو انھیں قتل نہ کرے، اس لیے کہ وہ مجبور کر کے لائے گئے ہیں۔ روایت ہے کہ جنگ بدر کے بعد وہ اسلام لے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ جنگِ خیبر سے پہلے اسلام لائے۔ ایک اور روایت ہے کہ وہ ہجرت سے قبل ہی اسلام لا چکے تھے، مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ سے مشرکین کے حالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لکھ کر بھیجا کرتے۔ آپ کے فتوحات کی خبر ملتی تو مسرور و شاداں ہوتے۔ بڑی بات یہ کہ

---

[1] ابن قدامہ، المغنی ۱۳/ ۱۵۲۔ حافظ ابن حجرؒ نے اختصار کے ساتھ یہ بحث نقل کی ہے۔ فتح الباری: ۳۰۸/۶

ان کی وجہ سے مکہ کے مستضعفین کوتقویت حاصل تھی۔روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ وہ مدینہ ہجرت کرنا چاہ رہے تھے،مگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کولکھا کہ مکہ میں ان کا قیام بہتر ہے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ چچا جان! آپ جہاں ہیں وہیں رہیے،اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہجرت کا سلسلہ ختم فرمائے گا،جس طرح اس نے نبوت کا سلسلہ میرے ذریعہ ختم کیا۔حضرت عباسؓ مکہ ہی میں مقیم رہے اور فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی۔[1]

نعیم بن عبداللہ النحام قدیم الاسلام ہیں۔مکہ میں دس نفوس کے بعد ہی اسلام لے آئے۔ایک روایت کے مطابق آپ اسلام لانے والے انتالیسویں (۳۹) شخص تھے۔ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے قبل اسلام لے آئے تھے، لیکن اپنے اسلام کوخفیہ رکھا۔وہ اپنے قبیلے بنوعدی کے یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتے اوران کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔اس وجہ سے ان کی قوم میں ان کا بڑا احترام تھا۔انھوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو بنوعدی نے کہا: آپ ہجرت نہ کریں،مکہ ہی میں رہیں اور اپنے دین پر عمل کریں۔کوئی آپ کو تکلیف پہنچانا چاہے گا تو ہم آپ کی حفاظت میں اپنی جانیں لڑادیں گے۔چناں چہ وہ مکہ ہی میں مقیم رہے۔سن ٦ ھ میں ہجرت کی۔ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فتحِ مکہ سے کچھ پہلے تک وہ مکہ ہی میں رہے۔جب مدینہ ہجرت کی تو ان کی قوم کے چالیس افراد ان کے ساتھ تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔[2]

ان واقعات سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ دارالاسلام موجود ہو اور ہجرت فرض

---

[1] ابن عبدالبر،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۲/ ۳۵۸، ۳۵۹۔ابن اثیر،اسد الغابہ: ۳/ ۱۶۳، ۱۶۴۔ابن حجر،الاصابۃ: ۳/ ۵۱۱

[2] ابن عبدالبر،الاستیعاب: ۴/ ۶۹-۷۰۔ابن اثیر،اسد الغابۃ: ۵/ ۳۲۶-۳۲۷۔ابن حجر، الاصابہ: ۶/ ۳۶۱-۳۶۲

ہو جائے تو بھی اگر کسی مسلمان کا دار الکفر یا دار الحرب میں قیام، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہو تو اس پر ہجرت فرض نہ ہو گی۔ اسی طرح کسی شخص کے لیے دار الحرب میں دین پر عمل اور دعوت و تبلیغ کے مواقع موجود ہوں تو بھی ہجرت اس کے لیے لازم نہ ہوگی۔ ظاہر ہے، جہاں دار الاسلام موجود ہی نہ ہو تو اس کے وجوب کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

جمہوری ممالک میں مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ جو آزادی انھیں میسّر ہے اور جو سہولتیں اور مواقع حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں، انھیں محض اپنی غفلت اور کوتاہی سے ضائع نہ کریں، بلکہ انہیں اسلام کے حق میں استعمال کریں۔ اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزاریں۔ اپنے عمل سے اسلام کی برتری کا ثبوت فراہم کریں۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو واحد راہِ نجات کی حیثیت سے پیش کریں اور اس کی حقّانیت واضح کریں۔ اس سے ان شاء اللہ قبولِ حق کے امکانات پیدا ہوں گے اور اللہ کے دین کو فروغ حاصل ہوگا۔

اس موقع پر ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے اور کہی جاتی ہے کہ اسلام کسی نظام کے تحت محکومی کی زندگی کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی عطا کردہ سہولتوں اور مواقع کو ایک مومن اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھے اور اس کا شکر گزار بنا رہے۔ وہ غلبہ اور سربلندی چاہتا ہے اور اس کے لیے جہاد کا حکم دیتا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ اسلام غلبہ اور سربلندی چاہتا ہے۔ لیکن جس غیر اسلامی ملک میں دعوت و تبلیغ کے مواقع حاصل ہوں اور وہاں کارِ دعوت جاری ہو اور اس راہ میں ناقابلِ برداشت رکاوٹ بھی نہ ہو تو وہاں سے ہجرت ہوگی اور نہ اس ملک میں جہاد ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو انقلابِ عظیم رونما ہوا اس کا آغاز مکہ میں شخصی اور اجتماعی دعوت سے ہوا۔ آپ نے فرداً فرداً بھی اللہ کا پیغام پہنچایا اور مکہ کی گلیوں اور کوچوں سے بھی آپ کی صدائے حق بلند ہوتی رہی۔ جب تک اہلِ مکہ نے دعوت کی راہیں مسدود نہ کر دیں اور مکہ سے آپ کے اخراج یا قتل کا فیصلہ نہ کر لیا آپ نے نہ تو مدینہ

ہجرت کی اور نہ مکہ میں رہتے ہوئے ان سے جنگ کی۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد جنگ کے احکام اور اس سلسلہ کی ہدایات نازل ہوئیں۔

قرآن مجید نے مکہ میں بھی 'جہاد' کا حکم دیا تھا، لیکن یہ 'جہاد بالسیف' نہیں، بلکہ 'جہاد بالحجۃ' تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ حکم تلوار کے ذریعے جہاد کا نہیں تھا، بلکہ دلائل کے ذریعے جہاد کا حکم تھا۔ ارشاد ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ (الفرقان: ۵۱)

پس تم کافروں کی بات نہ مانو اور اس قرآن کے ذریعے ان سے جہاد کرو۔ بڑا جہاد۔

اس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ تمہیں توحید اور خدا پرستی کی راہ سے پھیر کر شرک اور بت پرستی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، تم ان کی بات نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان کا مقابلہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کفر وشرک کے ماحول میں راہِ حق پر ثابت قدم رہے گا اور قرآن اور اس کی تعلیمات کے ذریعے 'جہاد کبیر' جاری رکھے گا۔ یہ دلیل وبرہان کے ذریعے دین کی دعوت وتبلیغ کا حکم ہے۔ کفر وشرک کے ماحول میں یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ اس لیے اسے 'جہاد کبیر' کہا گیا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"مکی دور کا جہاد، علم اور بیان کے ذریعے تھا۔ اور مدنی جہاد مکی طریقۂ جہاد کے ساتھ طاقت اور ہتھیار کے استعمال سے بھی تھا۔ سورۂ فرقان مکی سورت ہے۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دلیل وبرہان سے جہاد کیا تھا۔ اس کے ساتھ آپ کو باطل سے کنارہ کش رہنے کا حکم تھا۔"[1]

علامہ قرطبیؒ سورہ فرقان کی اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

"ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہاں قرآن کے ذریعے جہاد کا حکم ہے۔ ابن زیدؒ کہتے ہیں کہ یہ اسلام کے ذریعے جہاد کا حکم ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ اس میں

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ: کتاب الفقہ: ۳۸/۲۸

جہاد بالسیف کا ذکر ہے۔لیکن یہ دور کی بات ہے۔اس لیے کہ سورت مکی ہے۔یہ قتال کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی۔“[1]

حقیقت یہ ہے کہ جن ممالک میں دعوت کے مواقع ہیں اور عملاً دعوت کا کام جاری ہے ان ممالک کے مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وہ صبر وثبات اور حکمت و دانائی کے ساتھ دعوت کو جاری رکھیں۔ان ممالک میں رہتے ہوئے ان کے خلاف جہاد کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت سے متعلق تفصیل سے اس عاجز نے الگ سے ایک مستقل مضمون میں بحث کی ہے۔[2] اس کا آخری حصہ یہاں دیا جارہا ہے۔اس میں ایک طرح سے مضمون کا خلاصہ آگیا ہے)۔

”موجودہ دور کے جمہوری ممالک میں اقلیتوں کو بیش تر بلکہ تمام تر وہ حقوق حاصل ہیں، جو ان ممالک میں قیام اور انھیں وطن بنانے کے لیے وجہ جواز فراہم کرتے، بلکہ لازم قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کا شمار بھی ان ہی ممالک میں ہوتا ہے۔ یہاں از روئے دستور تمام شہریوں کے حقوق یکساں ہیں۔ جو حقوق اکثریت کو حاصل ہیں وہی حقوق اقلیتوں کے بھی ہیں، بلکہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی دستور میں خاص طور پر ضمانت دی گئی ہے۔

ہندوستان کے دستور نے یہاں کے ہر شہری کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں، ان میں عقیدہ و مذہب کی آزادی بھی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کا ہر شخص جو عقیدہ چاہے رکھ سکتا اور جو مذہب چاہے اختیار کرسکتا ہے۔کسی کو کسی مذہب اور عقیدہ کا پابند نہیں بنایا گیا ہے۔اسے اپنے مذہب کے مطابق عبادت اور عمل کرنے اور مذہبی تعلیم اور مذہبی ادارے چلانے کا حق ہے۔وہ مذہب کی تبلیغ کا حق رکھتا ہے۔ہر مذہبی گروہ کو اپنے پرسنل لا

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳۹/۱۳، یہی بات امام رازی نے کہی ہے۔التفسیر الکبیر: ۸۷/۲۴

[2] ملاحظہ ہو تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث، مضمون ’ہندوستان کی شرعی وقانونی حیثیت، ص ۳۹-۵۲

پر عمل کی اجازت ہے۔

ان دستوری حقوق کی رو سے ہندوستان کے مسلمان بغیر کسی روک ٹوک کے اسلامی عبادات بجالا سکتے ہیں۔نماز، روزہ اور حج جیسے فرائض ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ کا نظم قائم کر سکتے ہیں۔ مساجد کی تعمیر اور ان کی آباد کاری سے انھیں باز نہیں رکھا جاسکتا۔ مدارس کے قیام اور دینی تعلیم کا انتظام ان کا قانونی حق ہے۔انھیں اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے میں، جوان کی خاندانی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے بہت بڑے حصہ کا احاطہ کرتا ہے، کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ وہ اسلام کو اللہ تعالیٰ کے دین کی حیثیت سے ملک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ اس کے اندر پوری نوعِ انسانی اور خود اس ملک کی فلاح موجود ہے۔

اسی طرح دستور نے ہر شہری کو اظہارِ خیال کی، جماعت سازی کی، تجارت، ملازمت اور پورے ملک میں سفر کی آزادی دی ہے۔ جائدادِ منقولہ اور غیر منقولہ رکھنے اور اس میں تصرف کرنے کا حق دیا ہے۔ ان تمام حقوق میں ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان کسی قسم کا فرق وامتیاز کرنا قانون کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ان وجوہ سے مسلمانوں کا اس ملک کو اپنا وطن بنانے اور یہاں رہنے بسنے کا فیصلہ محض قانونی یا سیاسی مجبوری نہیں، بلکہ شرعی حکم اور دین کا تقاضا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں دستور کی خلاف ورزی بھی ہوتی ہے، اور ظلم وزیادتی کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی مذہب کے نام پر کش مکش اور تصادم بھی ہوتا ہے، لیکن یہ سب قانون کی نظر میں جرم ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنے کی ہر شہری کو اجازت ہے اور اس کے مواقع بھی حاصل ہیں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

جب ہندوستان شرعاً اور قانوناً یہاں کے مسلمانوں کا وطن ہے۔ یہاں وہ اپنے

مسلّمہ حقوق کے ساتھ رہ رہے ہیں تو انھیں ممکنہ حد تک شرعی زندگی گزارنی لازم ہے۔ وہ شریعت کے ان تمام احکام کے مکلّف ہیں، جنہیں وہ انجام دے سکتے ہیں۔ جن احکام پر عمل نہیں کر سکتے، ان کے سلسلے میں کوشش کرنی ہوگی کہ اس کے مواقع حاصل ہوں۔

آج کے جمہوری ممالک یا ہندوستان جیسے جمہوری ملک کی سی صورتِ حال غالباً ماضی میں نہیں تھی، اس لیے قدیم فقہا کے ہاں اس پر بحث نہیں ملتی، البتہ انھوں نے دارالاسلام یا دارالحرب کی جو بحثیں کی ہیں، ان سے اس سلسلے میں مدد اور راہ نمائی ضرور ملتی ہے۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ جمعہ کا قیام اسلامی ریاست کے امام یا اس کے نائب (مقرر کردہ فرد) کے ذریعے ہوگا۔ لیکن امام یا اس کا نائب موجود نہ ہو تو مسلمان اپنے طور پر جمعہ قائم کریں گے۔ اس لیے کہ یہ ایک (دینی) ضرورت ہے۔ اسی طرح کسی شہر کا (مسلمان) حاکم مسلمانوں کو نقصان پہنچانے یا عناد اور دشمنی میں جمعہ کے قیام سے منع کردے (یا اس معاملہ میں بے توجہی برتے) تو مسلمانوں کا اپنے اتفاق سے کسی کو ذمہ دار بنا کر اس کے پیچھے جمعہ ادا کرنا جائز اور درست ہوگا۔[1]

ایک صورت یہ بیان ہوئی ہے کہ کسی (اسلامی) شہر کا والی اور حاکم غیر مسلم ہو تو مسلمانوں کا اپنے طور پر جمعہ قائم کرنا درست ہے اور وہ باہم اپنی مرضی سے قاضی مقرر کر سکتے ہیں۔ البتہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان حاکم کے تقرر کا مطالبہ کریں۔[2]

'جامع الفصولین' کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ جن شہروں میں کفار کی حکومت ہو، وہاں کے مسلمانوں کے لیے اپنے طور پر جمعہ اور عیدین کا نظم کرنا درست ہے۔ وہاں مسلمان اپنی مرضی سے قاضی مقرر کریں تو وہ (شرعاً) قاضی ہوگا۔ البتہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مسلمان حاکم کا مطالبہ کریں۔[3]

---

[1] ابن عابدین ردالمحتار علی الدرالمختار: ۳/ ۱۴
[2] حوالہ سابق
[3] حوالہ سابق: ۶/ ۲۸۹

یہ بحثیں گو فروعی نوعیت کی ہیں، لیکن اہم مسائل سے متعلق ہیں اور اس پس منظر میں کی گئی ہیں کہ اسلامی ریاست کے حکم رانوں کی طرف سے اسلامی احکام پوری طرح نافذ نہ ہوں یا اسلامی ریاست کے کسی حصہ پر غیر مسلموں کا مکمل یا نامکمل قبضہ ہو جائے، جس کے نتیجے میں وہاں حسب سابق مسلمان قاضی باقی رہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی رہ سکتے۔ ان مباحث سے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ جن جمہوری ممالک میں غیر اسلامی حکومتیں قائم ہیں وہاں کے مسلمانوں کے درمیان ایسا نظم ضرور ہونا چاہیے کہ وہ شرعی زندگی گزار سکیں اور اپنے معاملات شرعی قوانین کے تحت طے کریں۔ اس کی کس جمہوری ملک میں کیا صورت ہو؟ اس پر تفصیل سے غور ہونا چاہیے اور اس کی تدابیر اختیار کی جانی چاہیے۔

جہاد اور اس کے احکام

جہاد اور اس کی اقسام

دنیا کے ہر علم وفن اور فلسفہ و مذہب کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اس سے انھیں صحیح اور بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن ان اصطلاحات کے وہی معنیٰ لیے جائیں گے جو خود اس فن یا مذہب نے متعین کیے ہیں۔ ان سے ہٹ کر ان کے کچھ دوسرے معنیٰ متعین کرنا غیر دانش مندی ہوگی۔ اس سے اندیشہ ہے کہ ان اصطلاحات کے مقصد اور منشا کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کی غلط تعبیر وتشریح کی جائے۔ یہی معاملہ اسلام کا ہے۔ اس نے بھی اپنے مقصد ومدعا کی ترجمانی کے لیے مخصوص اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ بعض اوقات ان پر اس طرح گفتگو ہوتی ہے جیسے ان کا مفہوم و مدعا ابھی تک واضح نہیں ہے اور اب اسے واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم محض زبان اور لغت سے یا کسی کے ذہنی مزعومات اور ذاتی خیالات سے متعین نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ان کا مفہوم خود اسلام سے معلوم کرنا ہوگا اور وہی مفہوم معتبر ہوگا، جو اس نے بیان کیا ہے۔ اس نے ایمان، کفر، نفاق، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج او رنسک جیسی متعدد اصطلاحات بکثرت استعمال کی ہیں اور ان کی تشریح بھی کردی ہے۔ عقیدہ وعمل کی دنیا میں ان کا مقام متعین کردیا ہے۔ ان میں مطلوب اور نامطلوب کی اچھی طرح وضاحت کردی ہے اور ان کے نتائج سے باخبر کردیا ہے۔ جو اعمال مطلوب ہیں ان کی انجام دہی کے طریقے اور حدود وشرائط بتادیے ہیں۔ ان سب سے واقفیت کے بغیر ان کے متعلق گفتگو نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کی ایک اصطلاح 'جہاد' ہے۔ بہت سے لوگ اس پر اس طرح

گفتگو کرتے ہیں جیسے جہاد کے معنیٰ ہیں مخالفین سے لڑنا، جھگڑنا، فساد کرنا، ناحق خون بہانا، بے سوچے سمجھے کسی پر حملہ کر دینا، دہشت گردی پھیلانا اور کسی بھی فرد، قوم اور ملک کو تباہ و برباد کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس انسان دشمنی اور درندگی کو کارِ ثواب، بلکہ فرض سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ مخالفین ہمیشہ اس کے نشانہ پر رہتے ہیں۔ جیسے ہی موقع ملے وہ ان پر چڑھ دوڑتا اور خوں ریزی شروع کر دیتا ہے۔ بعض لوگ اسے 'مقدس جنگ' کا نام دیتے ہیں اور تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ غیر مقدس اور ناپاک جنگ اور کوئی نہ ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ 'جہاد' کا یہ مفہوم کہاں سے اخذ کیا گیا؟ کس آیت یا حدیث میں یہ بیان ہوا ہے؟ یا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے کس اُسوہ سے اس کا ثبوت مل رہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس خوف ناک اور بھیانک تصورِ جہاد کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ——— 'قلم در کفِ دشمن است'۔

جہاد کا معنیٰ و مفہوم

قرآن مجید میں جہاد اور اس کے مشتقات کا ذکر چھتیس (۳۶) بار آیا ہے۔ یہ ذکر مکی سورتوں میں بھی ہے اور مدنی سورتوں میں بھی۔ آیئے، اُن کی روشنی میں دیکھیں کہ 'جہاد' کے کیا معنیٰ ہیں؟ کیا یہ حرب و ضرب اور جنگ ہی کے لیے بولا جاتا ہے یا اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے؟

جہاد کا مادہ جہد ہے۔ اس میں جدوجہد اور مشقت کا تصور ہے۔ اسی سے جہاد اور مجاہدہ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں سخت محنت اور انتہائی جدوجہد کرنا۔ اس میں مقابلہ کا تصور بھی ہے۔ یہ جدوجہد اور مقابلہ حالتِ جنگ اور محاذِ جنگ پر حریف کے خلاف بھی ہوتا ہے اور اس کے دوسرے میدان بھی ہیں۔ یہ زبان کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔[1]

---

[1] لسان العرب میں ہے: الجهاد المبالغة و استفراغ الوسع فى الحرب واللسان اوما اطاق من شيء ۳/ ۱۳۵، مادہ ج، ہ، د

علم و عمل اور اصلاحِ نفس کی جو کوشش ہوتی ہے اور اس کے لیے جو مشقت برداشت کی جاتی ہے وہ بھی جہاد ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں:

جہاد کے اندر مشقت کا تصور ہے۔ شریعت میں جہاد کا مطلب ہے معاندین سے جنگ میں قوت کا لگانا۔ فرماتے ہیں: جہاد کا لفظ نفس، شیطان اور فساق کے ساتھ مجاہدہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مجاہدۂ نفس ہے دین کا علم حاصل کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا اور پھر اس کی تعلیم دینا۔ شیطان سے مجاہدہ یہ ہے کہ جو شبہات اور وساوس وہ دل میں ڈالتا ہے اور خواہشات کا، جنہیں وہ بہت ہی حسین اور خوب صورت بنا کر دکھاتا ہے، مقابلہ کیا جائے۔ معاندین سے مجاہدہ، قوت اور طاقت سے، مال سے، زبان اور دل سے ہوتا ہے۔ فاسقوں کے ساتھ مجاہدہ قوت سے، زبان سے اور دل سے ہوگا۔[1]

جہاد کی ان مختلف صورتوں کا قرآن وحدیث میں ذکر ہے۔

اعدائے دین سے جنگ کے ذریعے جہاد کا حکم تو مدینہ میں آیا، جہاں اسلامی ریاست قائم تھی اور مسلمانوں کو اجازت حاصل تھی کہ وہ اپنے مخالفین کے جور وستم اور ریاست پر حملوں کا جواب دیں۔ مکہ میں بھی جہاد کی ترغیب دی گئی، جہاں مسلمان سخت نازک حالات سے گزر رہے تھے اور ان کے ساتھ بے پناہ زیادتیاں ہورہی تھیں اور وہ اپنا دفاع کرنے کے موقف میں بھی نہیں تھے۔ یہ جنگ سے مختلف نوعیت کا جہاد تھا۔ سورۂ عنکبوت مکہ میں بڑے زہرہ گداز حالات میں نازل ہوئی، اس کے شروع ہی میں جہاد کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝ (العنکبوت:٦)

اور جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے اپنی ہی ذات کے فائدہ کے لیے کرتا ہے اور اللہ تو تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ٦/ ٧٧

یہ دراصل مخالف ماحول میں دین پر استقامت اور احکامِ الٰہی کی پابندی کی ہدایت تھی۔ اسی کو جہاد یا مجاہدہ کہا گیا اور اسی میں انسان کی کام یابی قرار دی گئی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جہاد کے لفظ میں جنگ اور دشمن سے مقابلہ کا تصور ہے، اس لیے ہمارے مفسرین مکی آیات میں بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکہ میں جنگ یا قتال کا حکم دیا گیا تھا، یا مکہ کے ماحول اور حالات میں بھی جہاد فرض تھا، بلکہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس لفظ میں کتنی وسعت ہے اور کن پہلوؤں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے؟ اس وجہ سے وہ جہاد کی تشریح کرتے ہیں تو قتال کے ساتھ جہاد کی دوسری صورتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چناں چہ علامہ قرطبیؒ نے سورۂ عنکبوت کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فِي الدِّينِ، وَصَبَرَ عَلَى قِتَالِ الْكُفَّارِ وَأَعْمَالِ الطَّاعَاتِ، فَإِنَّمَا يَسْعَى لِنَفْسِهِ، أَيْ ثَوَابُ ذَلِكَ كُلِّهِ لَهُ، وَلَا يَرْجِعُ إِلَى اللَّهِ نَفْعٌ مِنْ ذَلِكَ.[۱]

جس نے دین کے معاملہ میں جہاد کیا اور مخالفین سے جنگ اور اعمالِ اطاعت پر استقامت کا ثبوت دیا تو اپنے ہی فائدے کے لیے کیا۔ یعنی اس کا پورا ثواب اسی کو ملے گا اور اللہ کو اس کا کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

اسی آیت کے ذیل میں علامہ بغویؒ کہتے ہیں:

الْجِهَادُ هُوَ الصَّبْرُ عَلَى الشِّدَّةِ وَيَكُونُ ذَلِكَ فِي الْحَرْبِ وَقَدْ يَكُونُ عَلَى مُخَالَفَةِ النَّفْسِ.[۲]

جہاد سختی پر صبر کرنے کا نام ہے۔ اس کا اظہار جنگ میں اور کبھی نفس کی مخالفت میں ہوتا ہے۔

یہی تشریح خازنؒ نے بھی کی ہے۔[۳]

۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۷، جزء ۱۳، ص ۲۱۳

۲۔ بغوی، معالم التنزیل علی ہامش الخازن ۵/۴۱

۳۔ خازن، حوالہ سابق

سورۂ عنکبوت ختم بھی جہاد ہی کے ذکر اور اس کی ترغیب پر ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (العنکبوت:٦٩)	اور جو مجاہدہ کریں ہمارے واسطے ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھائیں گے۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے یہاں بھی جہاد کو منکرین و معاندین سے جہاد کے معنیٰ میں لیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

أيْ جَاهَدُوا الْكُفَّارَ فِينَا. أيْ فِي طَلَبِ مَرْضَاتِنَا.	یعنی جو کفار سے جہاد کریں، ہمارے واسطے یعنی ہماری خوش نودی حاصل کرنے کے لیے۔

اس کے بعد خود ہی فرماتے ہیں کہ سدیؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جنگ فرض ہونے سے قبل نازل ہوئی تھی (اس لیے یہاں جنگ مراد نہیں ہو سکتی) ابن عطیہؒ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول اصطلاحی جہاد سے پہلے ہوا تھا۔ اس میں اللہ کے دین کی خاطر اور اس کی رضا کی طلب میں عمومی جہاد کا حکم ہے۔ ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں: اس آیت میں جس جہاد کا ذکر ہے اسے صرف قتالِ کفار سے متعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس میں دین کی نصرت، باطل خیالات کی تردید اور ظالموں کا قلع قمع کرنا بھی داخل ہے۔ ان میں سب سے نمایاں پہلو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہے۔ اس میں نفس کا مجاہدہ بھی آتا ہے جو جہادِ اکبر ہے۔[۱]

اس آیت کے ذیل میں علامہ بغویؒ کہتے ہیں:

کہا گیا ہے کہ مجاہدہ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی پر صبر کے ساتھ جمنے اور خواہشات کی مخالفت کا نام ہے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو لوگ طلبِ علم میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کو علم و عمل کی راہیں دکھاتے ہیں۔ سہل بن عبد اللہؒ کہتے ہیں جو ہمارے راستے میں اقامتِ سنت کی کوشش کریں گے ہم انھیں

۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۷، جزء ۱۳، ص ۳۶۴

جنت کی راہیں دکھائیں گے۔[1]

امام رازیؒ کے نزدیک یہاں وہ جدوجہد مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی راہ میں کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

جو اطاعت کے ذریعے جدوجہد کرے اسے اللہ تعالیٰ جنت کے راستے دکھائے گا۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ مکہ میں جہاد خارج کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے معنیٰ میں نہیں تھا، بلکہ یہ جہادِ نفس کی سرکش طاقتوں کے خلاف تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں صبر و استقامت کے لیے تھا۔ یہ علمی لحاظ سے اپنے آپ کو تیار کرنے اور کردار کے پہلو سے خود کو مضبوط بنانے کے لیے تھا۔ یہ وہ جہاد ہے جو زندگی بھر جاری رہتا ہے اور اسے لازماً جاری رہنا چاہیے۔

جہادِ نفس

انسان کے اندر خیر و شر دونوں طرح کے جذبات اور محرکات پائے جاتے ہیں۔ اگر انسان کو اپنے نفس پر قابو نہ ہو تو وہ اسے برائیوں کی ترغیب دیتا اور معصیت پر ابھارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری سے باز رکھتا اور خیر کی طرف قدم بڑھانے سے منع کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) بے شک نفس بدی پر بری طرح اکسانے والا ہے۔

نفس کی اس کیفیت کے خلاف جدوجہد کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کی طرف موڑنا بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ یہ مجاہدۂ نفس شریعت میں مطلوب ہی نہیں، واجب اور ضروری ہے۔ حدیث میں مومن کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ حضرت فضالہ بن عبیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] بغوی، معالم التنزیل علی ہامش الخازن ۵/ ۶۰

[2] رازی، مفاتیح الغیب: ۲۵/ ۸۳

نے فرمایا:

الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ [1] — مجاہد وہ ہے جس نے اپنے نفس سے جہاد کیا۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبَ [2] — مجاہد وہ ہے جس نے اپنے نفس سے اللہ کی اطاعت کے لیے جدوجہد اور کش مکش کی اور مہاجر وہ ہے جس نے خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دیا۔

اس کے ذیل میں ملا علی قاریؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے نفس سے جہاد ہی جہادِ اکبر ہے۔ اسی سے جہاد اصغر ابھرتا ہے۔[3]

نفس کے ساتھ اسی جہاد کے متعلق حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ 'آدمی جہاد کرتا ہے، جب کہ اسے مدت العمر ایک بار بھی تلوار نہیں چلانی پڑتی۔'[4]

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: "أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ" سب سے بہتر انسان کون ہے؟ آپ نے فرمایا:

رَجُلٌ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِمَالِهِ وَنَفْسِهِ [5] — وہ شخص جو اللہ کے راستے میں اپنے مال اور نفس کے ذریعہ مجاہدہ کرے۔

جہاد فی سبیل اللہ یا اللہ کے راستہ میں جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اس میں 'دشمنانِ حق' کے ساتھ قتال یا جنگ کے ساتھ اللہ کی اطاعت کے لیے نفس سے کش مکش بھی داخل ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الرقاق میں ایک عنوان قائم کیا ہے: باب من جاهد نفسه فی طاعة الله یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جس نے اپنے نفس سے

---

[1] ترمذی، فضائل الجہاد، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطا۔

[2] مسند احمد: ۶/۲۱، ۳۶۔ مشکوٰۃ، کتاب الایمان بحوالہ بیہقی

[3] ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکوٰۃ المصابیح: ۱/۱۹۹

[4] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۳/۴۰۴

[5] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والرباط

جہاد کیا اس کی فضیلت کا بیان۔ اس باب کے تحت حافظ ابن حجرؒ نے علماء کے حوالہ سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

مجاہدہ سے مراد نفس کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے علاوہ کسی دوسری چیز کا قصد کرے۔

محدث ابن بطالؒ کہتے ہیں کہ نفس سے جہاد کامل ترین جہاد ہے۔ یہ جہاد یہ ہے کہ نفس کو معاصی کے ارتکاب سے اور شبہات میں پڑنے سے باز رکھا جائے اور جائز اور مباح خواہشات کی تکمیل میں بہت زیادہ لگے رہنے سے منع کیا جائے، تاکہ یہ سب چیزیں آخرت میں اس سے کہیں زیادہ اسے نصیب ہوں۔

امام قشیریؒ کہتے ہیں کہ اصل مجاہدۂ نفس یہ ہے کہ اسے مالوفات سے چھڑایا جائے اور خواہشات کے خلاف چلایا جائے۔ نفس کی دو خصوصیات ہیں: ایک ہے شہوات میں انہماک اور دوسری ہے اطاعت و فرماں برداری سے بے رغبتی اور دوری۔ مجاہدہ اس کے حسبِ حال ہوتا ہے۔

بعض ائمہ نے کہا ہے کہ دشمن سے جہاد کے مفہوم میں نفس سے جہاد داخل ہے، اس لیے کہ دشمن تین ہیں: ان میں سب سے بڑا دشمن تو شیطان ہے۔ پھر نفس ہے جو (ایک مومن کو) ان لذتوں کی دعوت دیتا ہے جو بسا اوقات حرام کے ارتکاب تک پہنچاتی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی موجب بنتی ہیں۔ شیطان اس معاملہ میں معاون اور مددگار ہوتا ہے اور لذتوں کو پرکیف اور پرکشش کر کے دکھاتا ہے۔ جو شخص خواہشات نفس کا ساتھ نہ دے اور ان کی مخالفت اور مزاحمت کرے وہ اپنے شیطان کو زیر کرتا ہے۔ مجاہدۂ نفس یہ ہے کہ آدمی اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر اور احکام کی اتباع اور اس کی نواہی سے اجتناب پر آمادہ کرے۔ بندہ اگر نفس پر قابو پالے تو معاندین سے مقابلہ بھی اس کے لیے آسان ہوگا۔ پہلا عمل جہادِ باطن ہے اور دوسرا جہادِ ظاہر۔ مختصر یہ کہ آدمی نفس کی تمام کیفیات اور حالات

میں چوکنا اور بے دار رہے۔ اس سے غفلت برتے گا تو نفس اور شیطان اس پر مسلط ہوجائیں گے اور ممنوعات ومحرمات میں اسے مبتلا کردیں گے۔ [۱]

اس موضوع سے متعلق ایک روایت عام طور پر مشہور ہے۔ یہ سند کے لحاظ سے کم زور ہے، لیکن معناً صحیح ہے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کسی غزوہ سے واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قَدِمْتُمْ خَيْرَ مَقْدَمٍ وَقَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الأَكْبَرِ [۲] تمھاری واپسی مبارک ہے۔ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آئے ہو۔

---

[۱] ابن حجر، فتح الباری: ۱۳/ ۱۳۸-۱۳۹، جہاد کی ان تینوں اقسام کا ذکر امام راغب نے بھی کیا ہے۔ المفردات فی غریب القرآن، مادہ جھد، ص ۱۰۸

[۲] علامہ زمخشری اس جہاد کے بارے میں کہتے ہیں: وبمجاهدة النفس والهوى وهو الجهاد الأكبر. عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه رجع من بعض غزواته فقال رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر "نفس اور خواہشات سے مجاہدہ ہی جہاد اکبر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ ایک غزوہ سے لوٹے تو فرمایا: ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں۔"

دونوں روایتوں میں فرق ہے۔ پہلی روایت میں غزوہ سے واپس ہونے والے صحابہ سے خطاب ہے۔ دوسری روایت بتاتی ہے کہ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک غزوہ سے واپسی پر فرمایا کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں۔ اس کی تشریح آپ نے یہ فرمائی کہ جہاد اکبر بندے کا اپنی خواہشات کے خلاف مجاہدہ ہے۔

تفصیلات سے قطع نظر اس حدیث کو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں اور دیلمی نے مسند میں نقل کیا ہے۔ علامہ مناوی کہتے ہیں: اسنادہ ضعیف۔ (التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/ ۱۹۵)۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اسے ثعلبی نے بغیر سند کے نقل کیا ہے۔ بیہقی نے اس کی روایت حضرت جابرؓ سے کی ہے، لیکن اس میں ضعف ہے۔ فرماتے ہیں: اس کے تین راوی یکے بعد دیگرے ضعیف ہیں۔ البتہ نسائی نے اپنی کتاب الکنیٰ میں اسے شام کے ایک تابعی ابراہیم بن ابوعبلہ کا قول کہا ہے۔ (زمخشری، الکشاف، سورۃ الحج، آیت نمبر ۷۸، ۳/ ۱۶۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو البانی، سلسلة الأحاديث الضعيفة و الموضوعة: ۵/ ۴۷۸-۴۸۱، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث سند اور معنی دونوں لحاظ سے بے اصل ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اسے معناً بے اصل کہنا صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث میں باطل طاقتوں کے خلاف جہاد کو 'جہادِ اصغر' اور اپنے نفس کے خلاف جہاد کو 'جہادِ اکبر' کہا گیا ہے۔ یہ بات دو پہلوؤں سے مبنی بر حقیقت ہے: ایک یہ کہ نفس کی سرکشی اور بغاوت اور نا مطلوب خواہشات کے خلاف جہاد ہر صاحب ایمان کو لازماً کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ فرض عین ہے۔ جب کہ باطل قوتوں سے جنگ فرض کفایہ ہے۔ اس میں بعض ہی افراد حصہ لیتے ہیں۔ عام حالات میں سب کی شرکت نہیں ہوتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان قوتوں سے مقابلہ اور محاذ آرائی کی نوبت کبھی کبھی آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی نہ آئے، لیکن نفس کے خلاف جہاد ہر وقت اور مسلسل کرنا پڑتا ہے، یہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: جہاد نفس کے چار درجات ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین حق عطا کیا ہے اور جو راہ ہدایت دکھائی ہے، آدمی اس کا علم حاصل کرے اور اس کے لیے تکلیف برداشت کرے۔ اس علم کے بغیر وہ دین و دنیا کی سعادت سے محروم ہوگا۔

دوسرے یہ کہ نفس کو دین پر عمل کے لیے آمادہ کرے، اس لیے کہ بغیر عمل کے محض علم نفع بخش نہیں۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ دین حق سے ناواقف ہیں ان کے درمیان دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دے ورنہ آدمی کتمانِ علم کا مجرم قرار پائے گا۔

چوتھے یہ کہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں جو تکالیف پیش آئیں انہیں برداشت کرے۔

یہ چار مراتب پورے ہوں تو آدمی 'ربانی' کہلائے گا۔[1]

---

[1] زاد المعاد فی هدي خير العباد۔ ۳/۱۱-۱۲۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: بندے کا اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس سے جہاد، اصل ہے۔ خارج میں دشمن سے جہاد اس کی فرع ہے۔ جہادِ نفس، خارج میں دشمن سے جہاد پر مقدم ہے۔ اگر نفس اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا پابند نہ ہو تو خارج میں دشمن سے نبرد آزما ہونے اور اس سے مقابلہ آرائی کا امکان نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی باہر کے دشمن سے مقابلہ کرے، جب کہ اس کے اندر کا دشمن اس پر غالب ہے۔ جب تک آدمی نفس سے جہاد نہ کرے، خارج کے دشمن سے مقابلے کے لیے نہیں نکل سکتا۔ زاد المعاد فی هدي خير العباد: ۳/۶، ۷

جہاد نفس کے لیے قرآن مجید میں 'صبر بالعبادۃ' کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی پر ثابت قدم رہنا اور اس کے لیے ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنا۔اس کی ہدایت ان الفاظ میں ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝ (مریم:۶۵)

وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی۔ پس تم اس کی عبادت کرو، اس کی عبادت پر جمے رہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا ہم نام (اس کی صفات والا) کوئی اور ہے؟

نماز پر صبر اور استقامت کا حکم اس طرح دیا گیا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ (طٰہٰ:۱۳۲)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس پر قائم رہو۔

وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے جو نفس کے ساتھ اس جہاد میں کامیاب ہو جائے۔

جہاد باللسان

جہاد زبان سے بھی ہوتا ہے۔اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے فروغ و اشاعت کے لیے زبان سے جو کوشش ہو وہ بھی جہاد ہے۔دعوتِ دین کے لیے تین طریقے اختیار کرنے کا حکم ہے۔ایک یہ کہ اسلام کو 'حکمت' کے ساتھ پیش کیا جائے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی وضاحت، دلائل و براہین سے اس طرح ہو کہ اس کا حق ہونا ثابت ہو جائے اور کسی بھی صاف ذہن اور غیر متعصب فرد کے لیے اس کی معقولیت اور معنویت کا انکار آسان نہ رہے۔ دعوت کے لیے دوسرا طریقہ 'موعظہ حسنہ' ہے۔اس میں انسان کے ضمیر، اس کی اخلاقی روح اور اس کے مذہبی جذبہ سے اپیل ہوتی ہے۔ اللہ، رسول اور آخرت کا تصور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔'موعظہ حسنہ' دعوت کے لیے ایک موثر اور کارگر تدبیر ہے۔ دعوت کا تیسرا طریقہ بحث اور گفتگو ہے۔ یہ معروف معنیٰ میں مذہبی

مباحثہ یا مناظرہ نہیں ہے، بلکہ قرآن کے الفاظ میں اسے 'جدالِ حسن' ہونا چاہیے، جس میں مشترک قدروں اور متفق علیہ امور کی بنیاد پر گفتگو ہوتی ہے اور مخاطب کو خود اسی کے مسلّمات کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔[۱]

اس طرح کارِ دعوت انجام دینا جہاد ہے۔ مکہ میں اسی کا حکم دیا گیا اور اسے 'جہادِ کبیر' کہا گیا۔ ارشاد ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ (الفرقان: ۵۱، ۵۲)

اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ پس تم کافروں کی بات نہ مانو اور اس قرآن کے ذریعے ان سے جہاد کرو۔ بڑا جہاد۔

مطلب یہ ہے کہ اب تک ہر آبادی میں اللہ کے رسول آتے رہے ہیں۔ ہم چاہتے تو یہ سلسلہ جاری رہ سکتا تھا، لیکن اب ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک پیغمبر ہو۔ چنانچہ آپ کی بعثت ساری دنیا کے لیے ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی ہدایات پر ثابت قدم رہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے منکر اور باغی ہیں ان کی اتباع نہ کریں اور ان سے 'جہادِ کبیر' جاری رکھیں۔ اسے 'جہادِ کبیر' اس لیے کہا گیا ہے کہ محاذِ جنگ پر دشمن سے نبرد آزما ہونا، تیغ و تبر سے حملہ آور ہونا، گولیاں برسانا، ٹینکوں کا چلانا اور ہوائی جہازوں کے ذریعے بم برسانا اور دشمن کی یورش کو سینہ پر روکنا اتنا مشکل نہیں ہے، جتنا مخالف ماحول میں دین پر ثابت قدم رہنا، حق و صداقت کو لے کر چلنا، علم بردارانِ باطل کے عزائم کا مقابلہ کرنا، ان کے سامنے نہ جھکنا اور اللہ کے دین کی طرف مسلسل دعوت دیتے رہنا اور اس راہ میں قدم قدم پر پیش آنے والی مزاحمتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرتے رہنا مشکل ہے۔ یہ شمشیر و سناں کی جنگ سے زیادہ دشوار ہے۔ ہمارے علماء نے صراحت کی ہے کہ یہی 'جہادِ کبیر' ہے اور مکہ میں اس کو جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

---

[۱] دعوت کے ان تینوں طریقوں کا ذکر سورۂ نحل آیت نمبر ۱۲۵ میں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب: سبیل رب - دعوت الی اللہ کا راستہ۔

أمره الله تعالىٰ بالجهاد من حين بعثه — اللہ تعالیٰ نے بعثت کے بعد ہی سے آپ کو جہاد کا حکم دیا۔

اس کے بعد اس آیت کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

فَهَذِهِ سُورَةٌ مَكِّيَّةٌ أَمَرَ فِيهَا بِجِهَادِ الْكُفَّارِ بِالْحُجَّةِ وَالْبَيَانِ وَتَبْلِيغِ الْقُرْآنِ[1] — یہ مکی سورت ہے۔ اس میں آپ کو دلیل وضاحت اور قرآن کی تبلیغ کے ذریعے کفار سے جہاد کا حکم دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهِ وَلِسَانِهِ[2] — مومن اپنی تلوار سے اور اپنی زبان سے جہاد کرتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد تلوار ہی سے نہیں، زبان سے بھی ہوتا ہے۔ زبان جنگ اور امن دونوں حالات میں استعمال ہوسکتی ہے۔ وہ تخریب کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے اور تعمیر کی خدمت بھی انجام دے سکتی ہے۔ ایک مومن کی زبان جب بھی کھلے گی، حق و انصاف کے لیے کھلے گی۔ دعوتِ دین، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے حرکت میں آئے گی۔ مومن کا کسی سے اختلاف ہوگا تو اسی کے لیے ہوگا اور اس کی جنگ ہوگی تو اسی کے لیے ہوگی۔

مدینہ میں منکرین اور منافقین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (التوبۃ: ۷۳) — اے نبیؐ: کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

یہ بات سورۂ حشر (آیت ۹) میں بھی کہی گئی ہے۔ الفاظ بھی یہی ہیں۔ ان آیات میں بیک وقت دو طرح کے جہاد کا حکم ہے۔ وہ لوگ جو اسلام کے دشمن ہیں اور

---

[1] زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ۵/۳۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پیش نظر کتاب کی بحث: ہجرت۔ احکام و شرائط

[2] مسند احمد: ۴۵۶/۳، ۴۶۰۔ ۳۸۷/۶، ۵۲۳

اسلامی ریاست پر حملہ آور ہیں، حکم ہے کہ قوت سے ان کو روکا جائے۔ ان سے جنگ کی جائے، تاکہ وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن مسلمانوں کے درمیان جو منافق تھے ان کے لیے یہ حکم نہیں تھا۔ ان سے جہاد کی نوعیت اس سے مختلف تھی۔ ان کے ساتھ جہاد، وعظ و نصیحت، تذکیر و تنبیہ اور زجر و ملامت کے ذریعہ ہوتا تھا۔ کسی منافق کی گردن نہیں ماری جائے گی اور نہ ماری گئی۔ جو فرد یا گروہ نفاق کے مرض میں مبتلا ہوا سے سمجھایا جائے گا، نصیحت کی جائے گی، اگر وہ کوئی ایسا عمل کرے، جس کی وجہ سے حد لازم آئے تو حد نافذ ہوگی۔ یہی ان کے ساتھ جہاد ہے۔ مفسرین نے اس فرق کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جلالین میں ہے:

جَاهِد الْكُفَّار بِالسَّيْفِ وَالْمُنَافِقِينَ بِاللِّسَانِ وَالْحُجَّة[1]	منکرین سے جہاد کرو تلوار سے اور منافقین سے زبان سے اور دلیل سے۔

بیضاویؒ کہتے ہیں:

جاهِدِ الْكُفَّارَ بالسيف. وَالْمُنَافِقِينَ بإلزام الحجة وإقامة الحدود[2]	منکرین سے جہاد کرو تلوار سے اور منافقین سے دلیل کی قوت سے اور ان پر حدود قائم کر کے۔

سورۂ حشر کی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

جاهِدِ الْكُفَّارَ بالسيف وَالْمُنَافِقِينَ بالحجة وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ واستعمل الخشونة على الفريقين فيما تجاهدهم به إذا بلغ الرفق مداه.[3]	منکرین سے جہاد کرو تلوار سے اور منافقین سے دلیل کے ذریعے اور ان کے ساتھ درشتی سے پیش آؤ۔ ان سے جس معاملہ میں جہاد ہو اس میں سختی کا استعمال کرو جب نرمی اپنی حد کو پہنچ جائے۔

ہاں اگر منافقین کا کوئی گروہ تلوار اٹھا لے، دشمنوں سے ساز باز کرے اور اسلامی

---

[1] سیوطی: تفسیر الجلالین، ص ۲۵۲

[2] بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل: ۱/ ۴۱۳

[3] حوالۂ سابق ۲/ ۵۰۷

ریاست کے خلاف بغاوت کر بیٹھے تو اس کے ساتھ جہاد بالسیف ہوگا۔ جب تک اس کی نوبت نہ آئے ان کے خلاف تلوار نہیں استعمال کی جائے گی۔

امت کے بگاڑ کو ختم کرنے اور اس کی فکری و عملی گم راہیوں کو دور کرنے کی کوشش کو بھی جہاد کہا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ، وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ، وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ[1]

اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کسی امت میں بھیجا اس میں اس کے مددگار اور ایسے اصحاب پائے گئے جو اس کی سنت کو پکڑے رہے اور اس کے حکم کی اتباع کرتے رہے۔ پھر ان کے بعد ان کے برے جانشین ہونے لگے جو وہ کہتے جن پر خود عمل نہیں کرتے تھے اور وہ کام کرتے جن کا انھیں حکم نہیں تھا۔ پس جو ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے، جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اس کے بعد تو رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

یہ حدیث صراحتاً بتاتی ہے کہ امت کی اصلاح کا عمل بھی جہاد ہے۔ اس جہاد کی اس پہلو سے بڑی اہمیت ہے کہ اسی سے امت کی وحدت برقرار رہے گی۔ یہ جہاد اسے جوڑے رکھے گا اور اس کی تقویت کا باعث ہوگا۔

زبان کے ساتھ قلم سے بھی یہ خدمت انجام دی جانی چاہیے۔ دونوں خیالات کے اظہار اور تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ ہیں۔ آج کا دور قلم کی حکم رانی کا ہے۔ اس کی رسائی

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ

زبان کے مقابلے میں زیادہ دور تک ہے۔ قلم نے زبان سے کئی گنا زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے۔

جہاد بالمال

قرآن مجید نے اللہ کی راہ میں جان اور مال کے ذریعے سے جہاد کو صداقت ایمان کی دلیل قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات: ۱۵)

مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک اور تردد میں نہیں پڑے اور اپنے اموال و انفس کے ذریعے سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہی اپنے (ایمان میں) سچے ہیں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت کا ذکر آچکا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ (بہترین انسان کون ہے؟) آپ نے فرمایا:

رَجُلٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ [1] وہ شخص جس نے اپنی جان اور اپنے مال سے جہاد کیا۔

اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جہاد، نفس اور جان ہی سے نہیں، مال سے بھی ہوتا ہے۔ جہاد نفس کا مفہوم جس طرح وسیع ہے اسی طرح جہاد بالمال کے مفہوم میں بھی وسعت ہے۔ اس میں غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنا، تعلیم و تربیت کے لیے خرچ کرنا، دعوت و تبلیغ اور دین کے فروغ کے لیے پیسہ صرف کرنا، دین کی سربلندی کے لیے مالی تعاون کرنا اور اسی نوعیت کے بہت سے اعمالِ خیر آسکتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی قرآن و حدیث میں جتنی صورتیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہر صورت کو جہاد بالمال کا نام دیا جاسکتا ہے۔ [2]

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والرباط

[2] اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'انفاق فی سبیل اللہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حقِ جہاد ادا کیا جائے

سورۂ حج کی آیت ۷۸ میں ارشاد ہے:

وَجٰهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ — اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں جس طرح جہاد کا حق ہے۔

سورۂ حج کو مفسرین نے مکی اور مدنی آیات کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ قرطبیؒ کے نزدیک یہ جمہور کی رائے ہے۔ اس کی انھوں نے تائید بھی کی ہے [1] لیکن اسے جمہور کی رائے نہیں کہا جا سکتا۔ علامہ بغویؒ اور خازنؒ کے نزدیک یہ مکی سورت ہے، البتہ اس کی چند آیات کا نزول مدینہ میں ہوا ہے۔ [2]

یہی رائے زمخشری کی ہے۔ [3]

سورہ حج مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی۔ چند آیات جو مدینہ میں نازل ہوئیں انہیں مقصد و مدعا کی وضاحت کے لیے اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ اس میں جہاد کا بلکہ اس کا حق ادا کرنے کا حکم ہے۔ غور طلب ہے کہ مکہ کے دور آخر تک یہ کس جہاد کا حکم تھا؟

آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس سے دشمن سے جنگ کا مفہوم بھی نکلتا ہے، لیکن مکہ میں دشمن سے مقابلہ آرائی اور جنگ کا حکم نہیں تھا۔ درحقیقت اس آیت میں اصلاح و تربیت کی طرف شدت سے توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لیے اس کے یہ معنیٰ بھی بیان ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں ان کی پوری طرح پابندی کی جائے اور ممنوعات شرع سے اجتناب کیا جائے۔ خواہشات نفس اور شیطانی خیالات کا مقابلہ کیا جائے۔ [4]

---

1. الجامع لاحکام القرآن جلد ۶، جزء ۱۲، ص ۳
2. تفسیر الخازن مع تفسیر البغوی: ۳۳۲/۴
3. الکشاف عن حقائق التنزیل: ۶۸/۳
4. الجامع لاحکام القرآن جلد ۶، جزء ۱۲، ص ۶۶

اس جگہ یہی معنیٰ زیادہ صحیح ہیں۔ مفسر ابوالسعودؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی جو تشریحات کی ہیں انہیں نقل کرنے کے بعد امام رازیؒ فرماتے ہیں:

وَالْأَوْلَى أَنْ يُحْمَلَ ذَلِكَ عَلَى كُلِّ التَّكَالِيفِ، فَكُلُّ مَا أُمِرَ بِهِ وَنُهِيَ عَنْهُ فَالْمُحَافَظَةُ عَلَيْهِ جِهَادٌ[1]

بہتر یہ ہے کہ اسے تمام تکالیف شرع پر محمول کیا جائے۔ ہر وہ بات جس کا حکم دیا گیا یا جس سے منع کیا گیا ہے، اس کی پابندی جہاد ہے۔

جہاد علمی

علمی اور فکری کاوشیں بھی جہاد کے حکم میں آتی ہیں۔ علامہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ جہاد، علم کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے علم، اصل اور جہاد اس کی فرع ہے۔ جہادِ علم، جہاد بالسیف پر مقدم ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس میں جہاد فرض عین ہوجائے تو اسے فوقیت حاصل ہوگی، ورنہ حصول علم مقدم ہوگا۔ فرماتے ہیں:

ثَبَاتُ الْجِهَادِ بِثَبَاتِ الْعِلْمِ وَإِنَّهُ فَرْعٌ لَهُ وَمَبْنِيٌّ عَلَيْهِ[2]

جہاد کا قیام علم کے قیام پر منحصر ہے۔ جہاد علم کی فرع اور اس پر مبنی ہے۔

جہاد علمی ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے۔ حالات وظروف کے لحاظ سے اس کی تیاری ہر دور میں جاری رہے گی۔

قتال کا وسیع مفہوم

قرآن مجید میں قتل اور اس کے مشتقات ایک سو ستر (۱۷۰) بار آئے ہیں۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قرآن نے قتل اور قتال کو دوسرے احکام سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ تاثر اس کے استعمال اور موقع و محل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے بعض

---

[1] التفسیر الکبیر: ج ۱۲، جزء ۲۳، ص ۶۴

[2] احکام القرآن ۳/ ۱۵۴

مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

قیامت کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا:

۱- قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (الذّٰریٰت:۱۰) مارے گئے اٹکل سے حکم لگانے والے۔

۲-امام راغبؒ کہتے ہیں:

لفظ قتل دعاء عليهم وهو من الله تعالى إيجاد ذلك[۱]

لفظ قتل ان کے لیے بددعا ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے حق میں ایجاد ہے۔

زمخشری کہتے ہیں:

دعاء عليهم، وأصله الدعاء بالقتل والهلاك، ثم جرى مجرى: لعن وقبح.[۲]

یہ ان کے لیے بددعا ہے۔ اس کی اصل قتل اور ہلاکت کی دعا ہے۔ پھر اس کا استعمال لعنت اور ناخوشی کے معنی میں ہونے لگا۔

یہی بات بیضاویؒ نے کہی ہے۔[۳]

سورۂ عبس کی آیت (۱۷) ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ مارا گیا انسان کس قدر وہ ناشکرا ہے۔

یہاں قتل کے معنیٰ ہیں، اللہ کی لعنت اور اس کی رحمت سے دوری۔ مطلب یہ کہ جو آدمی اللہ کا منکر اور احسان فراموش ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ یہ انتہائی بددعا کے الفاظ ہیں۔

۳-ٹھیک اسی معنیٰ میں قُتِلَ کا لفظ سورہ مدثر کی آیات میں استعمال ہوا ہے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ○ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ○ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ○ (المدثر:۱۸-۲۰)

اس نے سوچا اور ایک بات طے کی، پس مارا جائے، کیسی بات سوچی اور پھر مارا جائے کہ کیسی بات سوچی۔

---

[۱] راغب، المفردات: مادہ قتل ص ۳۹۴ [۲] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/ ۳۴۴
[۳] بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۲/ ۴۳۸

۴- ایک جگہ یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے۔ فرمایا:

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ○ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے، کہاں یہ عقل سے پھیرے جا رہے ہیں۔ (التوبۃ: ۳۰)

اس طرح کی تمام آیات میں قتل یا قاتل کے معنیٰ اللہ کی رحمت سے محرومی اور بدنصیبی کے ہیں۔ ان کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حریف طاقتوں کا مقابلہ

قرآن مجید میں قتل اور اس کے مشتقات کا استعمال حریف طاقتوں سے جنگ کے لیے بھی ہوا ہے۔ ان میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کا مقصد کیا ہے؟ اس کے شرائط کیا ہیں؟ اللہ کے رسولوں اور ان کے جانشینوں نے بھی مختلف ادوار میں جنگ کی ہے اور اللہ کی راہ میں جان لڑائی ہے۔ اس کے کیا محرکات اور عوامل تھے؟ مذہب کے غلط پیروکاروں نے اللہ کے رسولوں اور عدل و انصاف کے علم برداروں کو قتل کیا ہے۔ ناحق قتل گناہ عظیم ہے۔ اہل ایمان کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے۔ کسی کی ناحق جان لی جائے تو اس کے ورثاء کو قصاص کے مطالبہ کا حق ہے۔ اس میں معاشرہ اور حکومت کی مدد اسے حاصل ہوگی۔ اللہ کی راہ میں شہادت، حیات ابدی کا باعث ہے۔

قتل اور اس کے مشتقات کے ذیل میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں، یہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان موضوعات پر غور کرنے سے جہاد اسلامی کی حقیقت بہ خوبی واضح ہوتی ہے۔ اس پر اعتراضات کا جواب بھی مل جاتا ہے۔

جو لوگ جہاد کو قتل و غارت گری، بے رحمی، تشدد اور وحشیانہ کردار کا ہم معنیٰ سمجھتے ہیں، انھیں اسلام کے پاکیزہ تصورِ جہاد کو سمجھنا چاہیے۔ زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے سخت محنت اور جدوجہد کو جہاد کہا جاتا ہے۔ یہ تربیت و تزکیہ، خیر کے پھیلانے، شر کے مٹانے، امت کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی صرف کرنے اور جان

و مال کھپانے کا نام ہے۔ بلا شبہ اسلام نے جنگ اور قتال کا حکم دیا ہے۔ اسے وہ جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد ایک پاکیزہ مقصد ہے۔ اس پاکیزہ مقصد کے لیے ناپاک طریقے یا ذرائع اختیار کرنے کی اس نے اجازت نہیں دی ہے۔ اس کے لیے وہ سخت شرائط اور حدود عائد کرتا ہے۔ اس پر ان شاء اللہ تفصیل سے آئندہ گفتگو ہوگی۔



معاندین سے جہاد

جہاد ـــــ دشمن سے جنگ کے معنیٰ میں

قرآن وحدیث میں جہاد کا لفظ جن معنوں میں آیا ہے اس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ اس کا اطلاق ذاتی اصلاح وتربیت اور خدمت دین کی مختلف انفرادی واجتماعی مساعی پر ہوتا ہے۔ اسے موقع ومحل اور سیاق وسباق سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کا استعمال حریف طاقتوں سے جنگ اور مقابلہ کے لیے بکثرت ہوا ہے، لیکن اسے قتل وغارت گری اور یورش کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اس کی تصویر اس قدر مسخ کردی گئی ہے کہ آج کا مرعوب ذہن اس کے استعمال ہی سے احتراز کرنے لگا ہے۔

اہل علم نے صراحت کی ہے کہ جب مطلق جہاد کہا جاتا ہے تو اس سے مراد دشمن سے جنگ کے ہوتے ہیں۔ لغت کی مشہور کتاب 'القاموس المحیط' میں جہاد کے معنیٰ القتال مع العدو (دشمن سے جنگ) بیان ہوئے ہیں۔ [1]

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فقہاء جب دشمن سے جنگ یا کفار سے جنگ کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد محارب قوموں سے ہوتی ہے، جن سے دار الاسلام حالت جنگ میں ہو۔ جن قوموں سے اس کی جنگ نہ ہو یا جن سے اس کا معاہدۂ امن وصلح ہو ان کے احکام دوسرے ہیں۔ اس کی تفصیل کتاب کے آئندہ مباحث میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے اور رسولؐ کی سیرت نے جہاد کے احکام اور حدود وشرائط کی اچھی طرح وضاحت کردی ہے۔ جہاں ان سے تجاوز ہوگا وہ جہاد فی سبیل اللہ نہ ہوگا، بلکہ فساد فی الارض ہو گا۔

---

[1] مجد الدین فیروز آبادی، القاموس المحیط، مادہ 'جہد'۔ ص ۲۵۰

قرآن مجید کی بکثرت آیات میں جہاد کا لفظ قتال کے معنیٰ میں آیا ہے۔ ایک جگہ قتال پر گفتگو کا آغاز ان الفاظ میں ہوا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (البقرۃ: ۲۱۴) تم پر قتال فرض کیا گیا ہے۔

یہ گفتگو اس آیت پر ختم ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (البقرۃ: ۲۱۸)

اس میں واضح طور پر جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح قتال یا جنگ کے معنیٰ میں استعمال ہوئی ہے۔

جنگِ احد کے پس منظر میں ارشاد ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝	کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے جب کہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہے جو تم میں سے لڑنے والے ہیں اور ان لوگوں کو نہیں معلوم کیا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ تم اس سے پہلے (اللہ کی راہ میں) مرنے کی تمنا کر رہے تھے اب تم نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ (آل عمران: ۱۴۲، ۱۴۳)

یہ پوری بات جنگ کے سیاق میں کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اندر سے ان جاں بازوں کو دیکھنا چاہتا ہے جو جہاد کے لیے نکلیں اور میدانِ کارزار میں پامردی کا ثبوت دیں۔ اس سے پہلے تم لوگ اللہ کی راہ میں جان دینے کی آرزو کر رہے تھے اور جان دینا چاہ رہے تھے۔ اب جب کہ اس کا موقع آیا اور آنکھوں کے سامنے موت دکھائی دینے لگی تو تم کم زوری دکھا رہے ہو۔

جہاد کی فضیلت

یہ اور اس طرح کی بہت سی آیات میں دشمن سے جنگ اور مقابلہ کو جہاد قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلے کے احکام اور ہدایات دی گئی ہیں۔ قرآن و حدیث میں جہاد کی غیر معمولی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس پر گناہوں سے مغفرت اور جہنم سے نجات کا وعدہ کیا گیا ہے اور آخرت میں جنت کی ابدی نعمتوں اور دنیا میں اقتدار اور سربلندی کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَّاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

(الصف: ۱۰-۱۳)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے نجات دے۔ وہ یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے حق میں، اگر تم جانو تو بہتر ہے (اس سے) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ہمیشہ کے باغات میں پاکیزہ مکانات دے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ ایک وہ چیز بھی ملے گی جو تم چاہتے ہو۔ وہ ہے اللہ کی مدد اور قریب کی فتح۔ اور مومنوں کو خوش خبری سنادو۔

قرآن نے احکام جہاد کے ذیل میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے جان و مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ ان پر اپنی مرضی نہیں، بلکہ اللہ کی مرضی چلتی ہے۔ وہ اس کے راستے میں جان اور مال دونوں ہی لٹاتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ○ (التوبۃ:۱۱۱)	بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال خرید لیے ہیں کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں، قتل بھی کرتے ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ اس کا یہ سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے وعدہ وفا کرنے والا۔ لہٰذا تم اپنی اس بیع پر (جان و مال کے عوض جنت کا حصول) جو تم نے کی ہے خوش ہو جاؤ۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

جنگ میں جان و مال کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس میں بہت سے دشوار گزار مراحل آتے ہیں۔ جنگ کے بعد بھی دیر تک اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ اس لیے آدمی طبعی طور پر اس سے بچنا چاہتا ہے، لیکن اعلیٰ مقاصد کے لیے یہ خسارہ کوئی خسارہ نہیں، بلکہ نفع کا سودا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا:

کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ وَہُوَ کُرۡہٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (البقرۃ:۲۱۶)	تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمھیں ناگوار گزرتی ہے۔ شاید تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ ممکن ہے، ایک چیز کو تم پسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کا حکم دیا ہے تو اس پر عمل میں تمھیں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے۔ وہ علیم و خبیر ہستی تمہارے سود و زیاں کو تم سے بہتر طریقہ سے جانتی ہے۔ اس نے جن اعلیٰ مقاصد کے لیے جنگ کا حکم دیا ہے وہ اگر پیش نظر ہوں تو جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا۔

ان آیات میں جہاد کی ضرورت و اہمیت کا بیان ہے، اس کے لیے جان و مال کی

قربانی کا مطالبہ ہے۔ راہِ خدا میں جان دینا اس کے نزدیک حیات ابدی کا ذریعہ ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝ (البقرۃ: ۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم اسے نہیں سمجھ سکتے ہو۔

جہاد کی فضیلت احادیث میں

احادیث میں جہاد کی غیر معمولی فضیلت آئی ہے۔ اسے بہت سی نفل عبادات سے افضل اور برتر قرار دیا گیا ہے۔ کسی وقت یہ فرض قرار پائے تو بعض دوسرے فرائض سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تم اسے نہیں کر سکو گے۔ دو بار یہی سوال کیا گیا اور آپ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ اس سوال پر فرمایا:

مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِآيَاتِ اللهِ، لَا يَفْتُرُ مِنْ صِيَامٍ، وَلَا صَلَاةٍ، حَتَّى يَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللهِ تَعَالَى[1]

اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس روزے دار کی ہے جو رات میں انابت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے قیام کرے، نہ روزے ختم کرے اور نہ نماز۔ یہ ثواب مجاہد کو ملتا رہے گا، جب تک کہ وہ لوٹ نہ آئے۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَغَدْوَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ رَوْحَةٌ، خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا[2]

اللہ کے راستے میں ایک صبح یا ایک شام گزارنا دنیا اور اس میں پائی جانے والی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ

[2] بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب الغدوۃ والروحۃ فی سبیل اللہ۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الغدوۃ والروحۃ فی سبیل اللہ۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ فرائض کے بعد جہاد سے زیادہ فضیلت والا عمل کوئی دوسرا نہیں ہے۔[۱]

ایک حدیث میں ایمان کے بعد جہاد کو سب سے افضل عمل کہا گیا ہے اور حج کا ذکر جہاد کے بعد ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے افضل عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ دریافت کیا گیا: اس کے بعد کس عمل کی فضیلت ہے؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے بعد فضیلت والے عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: 'حج مبرور' یعنی وہ حج جو خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو۔[۲]

جہاد میں آدمی اللہ کے راستے میں گھر بار چھوڑتا ہے۔ اسی طرح حج میں بھی وہ اللہ ہی کی رضا و خوش نودی کے لیے گھر سے نکلتا ہے، لیکن جہاد جس وقت فرضِ عین ہو جائے اور محاذِ جنگ پر جانا ضروری قرار پائے تو حج پر اسے ترجیح حاصل ہوگی۔

اسلامی ریاست کی سرحد کی حفاظت کس قدر باعث اجر و ثواب ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کی ایک روایت میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

رِبَاط يَوْم فِي سَبِيل الله، خير من الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَمَوْضِع سَوط أحدكُم من الْجنَّة خير من الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، والروحة يروحها العَبْد فِي سَبِيل الله أَو الغدوة خير من الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا[۳]

اللہ کے راستے میں سرحد کی حفاظت کے لیے ایک دن قیام کرنا دنیا اور اس کے اوپر پائی جانے والی سب چیزوں سے بہتر ہے۔ جنت میں تمہارے کوڑے (کے برابر) جگہ دنیا اور اس کی ساری چیزوں سے بہتر ہے۔ اللہ کے راستے میں بندہ ایک شام یا ایک صبح جو گزارتا ہے وہ دنیا اور اس کے سارے ساز و سامان سے بہتر ہے۔

---

[۱] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۱۰ [۲] بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال۔ [۳] بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فضل رباط یوم فی سبیل اللہ

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ریاست کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جہاد کرنا، حرم کعبہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں اعتکاف کرنے اور ذکر و تلاوت میں مشغول رہنے سے افضل ہے۔[1]

اسلامی ریاست کی حفاظت کے لیے جو کوشش ہو، اس کی اہمیت اور فضیلت اس سے واضح ہوتی ہے۔

ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا کو امن و سلامتی کا درس دیا، طبقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی نوعِ انسانی کو اخوت و مساوات کی راہ دکھائی، دنیا کو حقوقِ انسانی کے تصور سے متعارف کرایا، جو ان حقوق کا سب سے بڑا وکیل ہی نہیں بلکہ پاسبان اور محافظ بنا رہا، دوسری طرف یہ بھی نظر آتا ہے کہ جہاد اس کی تعلیمات کا لازمی حصہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس نے حکمِ جہاد کے ذریعے اپنی ہی ان تعلیمات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ جس دین نے ظلم و زیادتی کے تمام راستے بند کیے تھے وہ جورِ ناروا کا علم بردار بن گیا؟

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان تعلیمات کے درمیان تضاد ہے۔ اسلام جب کم زور تھا اور مکّی دور سے گزر رہا تھا تو اس نے درسِ اخلاق دیا، صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی تعلیم دی۔ مدینہ میں اسے سیاسی قوت حاصل ہوئی تو علمِ جہاد بلند کر دیا۔ یہ ان تعلیمات کو صحیح رخ سے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ہی مقصد کی تکمیل کرتی ہیں۔ آئندہ صفحات میں جہاد کی صحیح نوعیت، اس کا پس منظر، فرد اور ریاست سے اس کا تعلق، اس کے احکام و شرائط سے بحث ہوگی۔ توقع ہے کہ اس سے حکمِ جہاد کو صحیح شکل میں دیکھا جا سکے گا اور اس سے متعلق غلط فہمیاں رفع ہوں گی۔

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۲۸/ ۵-۶

جہاد (جنگ) کا تعلق اسلامی ریاست سے ہے

جہاد کا فیصلہ ریاست کرے گی

جہاد اسلامی ریاست کے دائرہ اختیار میں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جہاد کرے گی۔ اسلامی ریاست میں بھی اس کا اختیار افراد کو نہیں ہے کہ جو چاہے جہاد کے نام پر کھڑا ہو جائے اور جسے دشمنِ اسلام سمجھے اس پر یورش کر دے۔ ریاست کی طرف سے جہاد کا اعلان ہو تو جن لوگوں کو اس میں شرکت کے لیے کہا جائے گا ان کے لیے شرکت لازم ہو گی۔ وہ بغیر عذر کے اس سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ ایسے نازک موقع پر جو لوگ کنارہ کش رہیں، قرآن مجید نے ان پر سخت تنقید کی ہے۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(التوبۃ: ۳۸، ۳۹)

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں دوڑو تو تم زمین سے چمٹ جاتے ہو؟ کیا آخرت کو چھوڑ کر تم دنیا کی زندگی پر خوش اور مطمئن ہو گئے ہو؟ حالاں کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی محض تھوڑا سا ساز و سامان ہے۔ اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ ریاست کا سربراہ یا امام جب جہاد کے لیے آواز دے تو جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں:

أَنَّ الْإِمَامَ إِذَا عَيَّنَ قَوْمًا وَنَدَبَهُمْ إِلَى الْجِهَادِ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ أَنْ يَتَثَاقَلُوا عِنْدَ التَّعْيِينِ وَيَصِيرُ بِتَعْيِينِهِ فَرْضًا عَلَى مَنْ عَيَّنَهُ لَا لِمَكَانِ الْجِهَادِ وَلَكِنْ لِطَاعَةِ الْإِمَامِ.[1]

جب امام کچھ لوگوں کو متعین طور پر جہاد کی دعوت دے تو ان کے لیے جائز نہ ہوگا کہ وہ تعیین کے بعد بیٹھے رہیں۔ اس لیے کہ امام متعین طور پر جن لوگوں کو جہاد کا حکم دے وہ ان کے لیے فرض ہو جاتا ہے۔ جہاد کی وجہ سے نہیں، بلکہ امام کی تعیین کی وجہ سے۔

جہاد امام کے تحت ہوگا

حدیث میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ جہاد سربراہِ ریاست یا امام کی سربراہی میں ہوگا۔ وہ جن لوگوں کو جہاد میں شرکت کا حکم دے، ان کے لیے اس کی تعمیل ضروری ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الفَتْحِ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، وَإِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوا[2]

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے، البتہ جہاد اور (اس کی) نیت باقی ہے اور جب تم سے جہاد کے لیے نکلنے کا مطالبہ ہو تو نکل پڑو۔

ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ جہاد امام کے تحت ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

إِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيُتَّقَى بِهِ، فَإِنْ أَمَرَ بِتَقْوَى اللَّهِ وَعَدَلَ، فَإِنَّ لَهُ بِذَلِكَ أَجْرًا وَإِنْ قَالَ بِغَيْرِهِ فَإِنَّ عَلَيْهِ مِنْهُ[3]

بے شک امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے تحفظ حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اللہ سے تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اس کا اسے اجر ملے گا، لیکن اگر وہ دوسرا رویہ اختیار کرے تو اس کا وبال اس پر ہوگا۔

---

[1] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۸/۹۱

[2] بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب وجوب النفیر الخ۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب المبایعۃ بعد فتح مکۃ الخ

[3] بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب الامام جنۃ الخ

حدیث کے الفاظ اَلْاِمَامُ جُنَّۃٌ (امام ڈھال ہے) کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح ڈھال مخالف کے حملوں کو روکتی ہے، اسی طرح امام دشمن کے وار کو روکتا ہے۔ وہ کسی فرد یا گروہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ امت کو کسی قسم کا ضرر یا تکلیف پہنچائے۔ اسی طرح افرادِ امت کو بھی ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی سے باز رکھتا ہے۔ آگے اسی کی تشریح کی گئی ہے کہ یقاتل من ورائه و یتقی بہٖ (اس کے پیچھے جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے مشکلات اور پریشانیوں میں تحفظ حاصل کیا جاتا ہے۔)[1]

ریاست کے لیے فوج کی اہمیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ریاست کا نگراں اور محافظ ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ ریاست کو دشمن کی یورش سے بچائے، لوگوں کو جان، مال اور ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرے اور کسی بھی جارحیت کے مقابلہ میں ڈھال بنا رہے۔ اس کے لیے وہ جہاد کرے تو ریاست کے شہری اس کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور اس کے جھنڈے تلے جہاد کریں گے۔ حدیث کے آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ حق و انصاف کا معاملہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب سے نوازے گا اور اگر وہ ظلم و زیادتی کی روش اپنائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی باز پرس ہوگی۔ بعض دوسری حدیثوں میں یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد ہمیشہ جاری رہے گا، لیکن یہ امام یا سربراہِ مملکت کے تحت ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ امام خدا ترس اور متقی ہو یا غلط کار اور فاسق، جب تک وہ امیر ہے، جہاد میں اس کا ساتھ دیا جائے گا اور اس کی قیادت میں جنگ کی جائے گی۔

---

[1] حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اَلْاِمَامُ جُنَّۃٌ کا مطلب یہ ہے کہ امام دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہوتا ہے اور مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یقاتل من ورائه کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ وراء کے اصل معنیٰ تو پیچھے کے ہیں، لیکن یہ لفظ آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں بولا جاتا ہے اور یہی دونوں معنی یہاں مراد ہیں۔ امام کے آگے اور پیچھے ہر طرف سے جنگ کی جائے گی اور اس کی حفاظت کی جائے گی۔ فتح الباری: ۶/ ۲۱۸

اَلْجِهَادُ وَاجِبٌ عَلَيْكُمْ مَعَ كُلِّ أَمِيرٍ، بَرًّا كَانَ أَوْ فَاجِرًا، وَإِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ[1]

جہاد تم پر واجب ہے ہر امیر کے ساتھ، چاہے وہ نیک ہو یا غلط کار اور چاہے وہ کبائر ہی کا ارتکاب کر رہا ہو۔

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ جہاد اسلامی ریاست کے امام یا امیر کے تحت ہوگا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ جہاد بے مقصد قتل وخوں ریزی نہیں، بلکہ اعلیٰ مقاصد کے لیے کی جانے والی جنگ ہے۔ اس کا تعلق بہت سے نازک ملکی اور بین الاقوامی مسائل سے ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوج کا پایا جانا اور اس کا پوری طرح کنٹرول میں اور حکم کا پابند ہونا ضروری ہے۔ پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ کس سے جنگ ہو اور کس سے صلح؟ اگر جنگ ہو تو اس کے کیا تقاضے ہیں اور صلح ہو تو کن شرائط پر ہو؟ جنگ کے بعد کے معاشی، سیاسی، اخلاقی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ جنگ میں فتح ہو تو مفتوح اقوام کے ساتھ کیا معاملہ ہو؟ شکست ہو تو اس کے کیا نتائج ہوں گے؟ اور ان پر قابو پانے کی کیا تدبیر کی جائے گی؟ یہ سب امور ریاست کے دائرے میں آتے ہیں اور وہی ان کی مخاطب ہے۔ اسلام نے بہت تفصیل سے ان تمام پہلوؤں سے ریاست کی راہ نمائی کی ہے۔ فرد اس کا مخاطب نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جہاد کا معاملہ ریاست سے متعلق ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

---

[1] ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب الغزو مع ائمۃ الجور۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابوداؤد اور ابویعلیٰ نے مرفوع اور موقوف دونوں طریقوں سے روایت کی ہے۔ اس کے راوی قابل قبول ہیں، البتہ یہ روایت ابوہریرہؓ سے مکحول تابعی نے کی ہے اور مکحول کا ابوہریرہؓ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ فتح الباری: ۶/ ۱۴۴

امیر اگر فسق و فجور میں مبتلا ہو تو امت کی کیا ذمہ داری ہے؟ امام الحرمینؒ کہتے ہیں ''حاکم وقت اگر ظلم و زیادتی اور من مانی کرنے لگے، فہمائش سے باز نہ آئے تو اہلِ حل وعقد کو متفق ہو کر اسے برطرف کر دینا چاہیے، چاہے اس کے لیے ہتھیار اٹھانا اور جنگ کرنی پڑے۔ شرح المقاصد: ۵/ ۲۳۳، ۲۳۴۔ یہ بات غالباً ان ممالک کے پیش نظر کہی گئی ہے جہاں بادشاہت یا آمریت ہو، لیکن جمہوری ملکوں میں بغیر تلوار اٹھائے پرامن طریقہ سے بھی تبدیلی آسکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

وأمْرُ الجِهادِ مَوْكولٌ إلى الإمامِ واجتهادِه، ويلزَمُ الرعِيَّةَ طاعَتُه فيما يَراه [1]

جہاد کا معاملہ امام اور اس کے اجتہاد کے حوالے ہے۔ عوام کے لیے لازم ہے کہ امام جو فیصلہ کرے اس میں اس کی اطاعت کرے۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

ولا يَخرُجُوا إلَى الْعَدُوِّ إلَّا بإذْنِ الأَمِيرِ، إلَّا أنْ يَفجأَهُم عَدُوٌّ غالبٌ يخافون كَلَبَه [2]

لوگ امیر کی اجازت ہی سے جہاد کے لیے نکلیں گے، الاّ یہ کہ کوئی طاقت ور خطرناک دشمن، ان پر اچانک حملہ کردے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا فیصلہ کرنا سربراہ مملکت کے ہاتھ میں ہوگا اور عام لوگ اس کے فیصلے کے پابند ہوں گے، البتہ اگر کبھی ریاست کے کسی حصہ پر خصوصاً سرحدی علاقہ پر دشمن کا اچانک حملہ ہوجائے اور ریاست کے سربراہ کو اس کی خبر ہونے یا اس کی طرف سے اقدام کرنے میں تاخیر ہو تو مقامی افراد بلا اجازت ملک کا دفاع کریں گے۔ [3] موجودہ دور میں اس طرح کی صورتِ حال کا امکان کم ہے۔ ہر حکومت سرحدی حالات سے باخبر رہتی اور باقاعدہ فوج سرحدوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس لیے جنگ کا فیصلہ بہرحال ریاست ہی کے اختیار میں ہوتا ہے۔

---

[1] ابن قدامہ: المغنی، ۱۶/۱۳

[2] ابن قدامہ: المغنی، ۱۵۲/۱۳

[3] اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

جہاد کی تیاری اور اس کی غرض و غایت

اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کے لیے ممکنہ تیاری کی ہدایت کی ہے۔ اسلامی ریاست اس کی پابند ہوگی، لیکن اسے عام طور پر اس طرح کا حکم نہیں سمجھا جاتا جس طرح دنیا کی حکومتیں اپنی ضروریات اور مصالح کے تحت فوجی تیاری کرتی ہیں۔ اس کے لیے قوانین اور ضوابط وضع کرتی اور احکام نافذ کرتی ہیں۔ اس کے بالکل برعکس یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک جنگ جو ریاست ہے اور اپنی مہم جوئی کے لیے وہ تیاری کرتی ہے۔ اس کی یہ تیاری امنِ عالم کے لیے خطرہ ہے۔ وہ عسکری لحاظ سے مسلح ہوگی تو دوسرے ملکوں پر یورش کر بیٹھے گی اور کسی اصول، قاعدے اور ضابطے کی پابند نہ ہوگی۔ گویا وہ ایک بے رحم اور اندھی بہری طاقت ہوگی جو دوسروں کو روندتی اور پامال کرتی چلی جائے گی۔ اِسی وجہ سے اسلامی ریاست کا تصور ہی آج کے ذہن کے لیے انتہائی ہول ناک ہے اور اس کی عسکری تیاری کے ذکر سے خوف اور خطرے کا ماحول پیدا ہو جاتا یا دانستہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل جہاد کی تیاری اور اس کی غرض و غایت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہاں اس سے متعلق بعض احکام اور ان کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ اس تیاری کی نوعیت کیا ہے اور اس کا جواز ہے یا نہیں؟

ساتویں صدی عیسوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو اہلِ عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا، جس کی پورے قبیلے پر حکم رانی ہوتی۔

افرادِ قبیلہ حق و ناحق اور صحیح و غلط ہر معاملہ میں اس کی ہم نوائی کرتے اور اس کا ساتھ دیتے۔ قبائلی عصبیت و حمیت رگ و پے میں پیوست تھی۔ اس کی خاطر وہ آسانی سے جان کی بازی تک لگا سکتے تھے۔ بعض قبائل کے درمیان خونی رشتے اور سماجی و معاشی تعلقات بھی تھے، لیکن زیادہ تر وہ خانہ جنگی اور باہمی تصادم کے شکار تھے۔ قتل وخوں ریزی عام تھی۔ لوٹ مار اور شب خون کا بازار گرم رہتا۔ قبیلے سے باہر کے کسی شخص کی جان، مال اور عزت وآبرو محفوظ نہ تھی۔ صحرائے عرب میں تنہا سفر کرنا دشوار تھا۔ قافلوں کی شکل میں سفر ہوتا اور قافلے بھی بسا اوقات لٹ جاتے۔ صحرا کی زندگی اور گرد و پیش کے حالات نے ہر شخص کو فوجی یا سپاہی بنا دیا تھا۔ وہ اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے ہر وقت تیار رہتا اور اپنی حربی صلاحیت کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہوتا۔ اسلام نے ان مختلف قبائل کو ایک امت بنایا اور قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ کی صورت میں ایک مکمل آئین اور قانون دیا، قبائلی اقتدار کو ختم کرکے باضابطہ ریاست قائم کی، اس کے متحارب قبائل کو ایک نظم کے تحت مجتمع اور متحد کیا اور جنگ جو افراد کو ایک باقاعدہ ریاست کے شہری کی حیثیت عطا کی اور انہیں آئین و قانون کا پابند بنایا۔ حالتِ جنگ اور حالتِ امن دونوں میں اخلاق اور قانون کی بالادستی قائم کی۔ جنگ کو کسی بھی فرد کی آزاد مرضی پر نہیں چھوڑا کہ جب چاہے جنگ کا سائرن بجادے اور جنگ شروع کردے، بلکہ اسے ریاست کے دائرۂ اختیار میں رکھا۔ اس کی تیاری کے معلوم و معروف ذرائع تجویز کیے اور اس کا مقصد واضح کیا۔

جنگ دو طرح کی ہوتی ہے: ایک دفاعی اور دوسری اقدامی۔ دونوں کے لیے مناسب تیاری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسلام نے ریاست کو عسکری لحاظ سے مضبوط ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لیے فرد اور ریاست کا مال خرچ کرنا اور اپنے وسائل کا استعمال کرنا اس کے نزدیک بڑے اجر وثواب کا باعث ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (الانفال:۶۰)

اور تیار رکھو ان کے لیے جس حد تک تم سے ہو سکے (فوجی) قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے، جس سے اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن پر خوف طاری رہے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں پر بھی تمہارا خوف رہے جنہیں تم نہیں جانتے، (لیکن) اللہ جانتا ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔

آیت کا آغاز وَاَعِدُّوْا لَهُمْ (ان کے لیے تیار رکھو) کے الفاظ سے ہوا ہے اَعِدُّوْا کا مصدر 'اعداد' ہے۔ اس کے معنیٰ بغویؒ اور خازنؒ نے لکھے ہیں: اتخاذ الشيء لوقت الحاجة[1] (کسی چیز کو ضرورت کے وقت کے لیے رکھنا) گویا اس میں ضرورت اور حاجت کا تصور ہے۔ یعنی یہ تیاری ضرورت کے تحت ہوگی اور ضرورت ہی کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

آیت میں جنگ کی تیاری کے ذیل میں 'قوۃ' اور 'رباط الخیل' کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر یہ آیت تلاوت فرمائی اور تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

اَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ[2] — سن لو، قوت تیر اندازی ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دورِ رسالت کے طریقۂ جنگ میں تیر اندازی یا ناوک فگنی کی خاص اہمیت تھی۔ اس میں آدمی دشمن کو قریب آنے سے روک سکتا اور ایک خاص فاصلے سے اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔ بعض اور حدیثوں میں بھی اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح اس فن کے سیکھنے کے بعد اسے بھول جانے یا اسے حقیر سمجھ کر نظر انداز

---

[1] بغوی، معالم التنزیل۔ خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۵۷/۳

[2] مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ وذم من علمہ ثم نسیہ

کرنے کی مذمت کی گئی ہے اور اسے سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ، ثُمَّ تَرَكَهُ، فَلَيْسَ مِنَّا. أَوْ قَدْ عَصَى[1]	جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اسے ترک کر دیا تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا یہ فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کی حدیث کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ اور اس مضمون کی دوسری احادیث سے تیر اندازی، اس کے مقابلے اور اس کے اہتمام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، بشرطے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہو۔ یہی حکم دلیری اور شجاعت کے مظاہرے، ہتھیار کے مختلف استعمالات کی مشق اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے کا ہے۔ ان سب کا مقصد جنگ کی تربیت اور اس میں مہارت پیدا کرنا اور جسم کو مضبوط بنانا ہے۔[2]

قرآن مجید نے جنگی تیاری کے سلسلے میں 'قوۃ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دورِ اول میں اس قوت کا بڑا ذریعہ تیر اندازی تھا، اس لیے اس کی خاص ترغیب دی گئی، لیکن ہر دور کی مناسبت سے جنگی قوت مختلف ہو سکتی ہے۔ اِسی وجہ سے مفسرین نے اسے عام رکھا ہے۔ زمخشریؒ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

من قوة: من كل ما يتقوّى به في الحرب من عددها[3]	وہ ساری چیزیں جن سے جنگ میں قوت حاصل کی جاتی ہے اس کے سامان میں شمار ہوں گی۔

یہی بات بیضاویؒ نے اِن الفاظ میں کہی ہے:

من كل ما يتقوى به في الحرب.[4]	(قوت سے مراد ہے) ہر وہ چیز جس سے جنگ میں تقویت حاصل کی جائے۔

---

[1] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ وذم من علیہ ثم نسیہ

[2] نووی: شرح مسلم، ج ۷، جزء ۱۳، ص ۵۶

[3] زمخشری، الکشاف: ۲/ ۲۲۴

[4] بیضاوی، انوار التنزیل ولباب التاویل: ۱/ ۳۸۹

امام رازیؒ کہتے ہیں کہ قوت سے بہت سی چیزیں مراد لی گئی ہیں، لیکن ان میں بہتر قول، جیسا کہ اصحابِ معانی نے کہا ہے، یہ ہے کہ یہ ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن سے جنگ میں تقویت حاصل کی جاتی ہے۔ 'قوت' کے لفظ میں تمام آلات حرب شامل ہیں۔[۱]

آیت میں جنگی تیاری کے ذیل میں رِبَاطُ الْخَيْلِ کا بھی ذکر ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں گھوڑوں کا فوجی مقاصد کے لیے تیار کرنا۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

میدانِ جنگ میں گھوڑوں کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ پیادہ فوج کے مقابلے میں وہ زیادہ بہتر خدمت انجام دیتے ہیں۔

آج کے دور میں اس تیاری میں باقاعدہ تربیت یافتہ فوج، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں، ہیلی کاپٹر، جنگی طیارے اور دورِ جدید کے تمام اسلحہ اور ساز و سامانِ حرب آجائیں گے۔ آئندہ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ اسلحہ اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے جنگی تیاری کے ذیل میں مَا اسْتَطَعْتُمْ کہا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ تیاری جس حد تک تم سے ہو سکے، ہونی چاہیے۔ کسی ریاست کے لیے فوجی تیاری کس حد تک ممکن ہے؟ اس کا فیصلہ، اس کی ضروریات، اس کی معیشت، علم و تحقیق، فنی واقفیت اور ملکی اور بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ہوگا۔

اس تیاری کا مقصد ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

'تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ' مطلب یہ کہ یہ تیاری اس لیے ہونی چاہیے کہ جو اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن ہیں ان کو خوف دلا سکو۔ ان پر تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ اس کے ساتھ فرمایا:

'وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ' یعنی بعض تو تمہارے کھلے

---

[۱] رازی: التفسیر الکبیر ج ۸، جزء ۱۵، ص ۱۴۸، نیز ملاحظہ ہو خازن: لباب التاویل: ۳/ ۵۸

حریف اور دشمن ہیں، انہیں تم پہچانتے ہو، لیکن وہ اعداء دین بھی ہیں، جن کی عداوت سے تم ناواقف ہو۔ کسی بھی وقت وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس جنگی تیاری کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھی تمہارے خلاف اقدام کرنے کی ہمت نہ کریں۔ گویا یہ جنگی تیاری ریاست کے علانیہ اور خفیہ دشمنوں کے مقابلہ میں ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف نہیں ہے جو ریاست کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ دراصل دوسروں پر حملہ یا اُن سے جنگ کا حکم نہیں ہے، بلکہ یہ جنگ بازوں کو جنگ سے روکنے کی تدبیر ہے۔ دنیا کا ہر ملک چاہتا ہے کہ اس کے پاس اتنی طاقت ہو کہ کوئی ملک اس پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ اسلام نے بھی اس کی ہدایت کی ہے۔

قرآن مجید نے جنگ کے سلسلے میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ پوری طرح محتاط، چوکس اور مسلح رہیں۔ سورۂ نساء میں احکام جہاد کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا

اے ایمان والو! اپنی احتیاط رکھو اور پھر ٹکڑیوں کی شکل میں یا ایک ساتھ (جہاد کے لیے) نکلو۔

(النساء:۷۱)

آیت کے الفاظ ہیں: خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔ حِذر یا حَذر کے معنیٰ ہیں بچنا اور احتیاط کرنا۔ یہ کسی خوف ناک یا نقصان دہ چیز سے ہوتا ہے۔ امام راغب 'حذر' کے معنیٰ بتاتے ہیں 'احتراز عن مخیف' (کسی خوف ناک چیز سے بچنا) اسی سے آلاتِ جنگ کے لیے بھی حذر کہا جانے لگا۔ اس لیے کہ یہ دشمن سے حفاظت اور اس کے حملوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ 'خُذُوْا حِذْرَكُمْ' کے معنیٰ امام راغب نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

ما فیہ الحذر من السلاح و غیرہ[1] وہ چیز جس میں احتیاط اور بچاؤ ہے، جیسے ہتھیار وغیرہ۔

زمخشریؒ کہتے ہیں: حَذر اور حِذر کے معنی ایک ہیں۔ آخذ حذرہ کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بیدار ہو گیا اور خطرناک چیز سے بچ گیا۔ گویا احتیاط اور بچاؤ کو اس نے اپنے

---

(۱) راغب، المفردات فی غریب القرآن: مادہ حذر، ص ۱۱۸

جسم و جان کی حفاظت کے لیے آلہ بنالیا۔[1]

پوری احتیاط اور جنگی تیاری کی ہدایت کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں یا بڑے لشکر کی شکل میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دے رہا ہے کہ وہ دشمن سے محتاط رہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ مقابلے کے لیے اسلحہ، ساز و سامان اور فوج کی تعداد میں اضافہ کے ذریعے تیار رہیں۔ اللہ کے راستے میں نکلنے کے لیے نفیر (جنگ کے لیے نکلنے کا حکم) سے فوج میں اضافہ ہوگا۔[2]

مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں اس احتیاط اور تیاری کی سخت ضرورت تھی۔ عرب کے مختلف قبائل اسلام اور اسلامی ریاست سے برسرِ پیکار تھے۔ ان کے مقابلہ کے لیے کبھی چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیجنے پڑتے اور کبھی بڑی فوج تشکیل دینی ہوتی۔ ان حالات کا مخلص و جاں باز اور سرفروش مسلمان جی جان سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کا سابقہ باہر کے دشمنوں کے علاوہ منافقین سے بھی تھا، جو مارِ آستین بنے ہوئے تھے، جو دل سے مسلمانوں کو ناکام دیکھنا چاہتے تھے۔ خود پست ہمتی کا مظاہرہ کرتے اور طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر دوسروں کی بھی ہمت شکنی کرتے۔ قرآن مجید نے اسی سلسلۂ بیان میں ان پر تنقید کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا:

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَاللّٰهُ	پس تم اللہ کے راستے میں قتال کرو۔ تم صرف اپنی ذات کے ذمے دار ہو۔ مومنوں کو (جنگ کی) ترغیب دو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ہے جنگ سے روک دے۔ اللہ

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۲۱

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۵۲۴

اَشَدُّ بَأْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا○ (النساء: ۸۴)	زیادہ شدید ہے جنگ میں اور زیادہ سخت سزا دینے والا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے اللہ کے رسول! جب اللہ کے راستے میں جنگ کا موقع آئے۔ آپ آگے بڑھیے، اس کی پروانہ کیجیے کہ کوئی ساتھ دے رہا ہے یا نہیں۔ آپ صرف اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں۔ اہل ایمان کو اس میں شرکت کی ترغیب دیجیے۔ وہ منافقین کی طرح پیچھے نہیں رہیں گے، بلکہ ان کی رفاقت آپ کو حاصل ہوگی۔

جہاد کے اس حکم کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ ضروری نہیں کہ آپ کو جنگ لازماً کرنی ہی پڑے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ دشمن کے جنگی عزائم بدل جائیں اور وہ اپنے مذموم ارادوں سے باز آ جائے اور آپ کو جنگ سے سابقہ نہ پیش آئے۔ لیکن اگر جنگ مسلط ہو تو آپ کو پوری قوت سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ دشمن کی طاقت سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، اس کی جتنی طاقت ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ طاقت ور ہے۔ یہ در حقیقت احتیاطی تدبیر اور خود حفاظتی کی کوشش ہے۔

سرحد کی حفاظت

ہمارے علماء نے مسلمانوں کے امام یا سربراہِ مملکت کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ داخلی اور خارجی حملوں سے ریاست کی حفاظت کرے۔ اسی میں سرحدوں کی حفاظت آتی ہے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○ (التوبۃ: ۱۲۳)	اے ایمان والو! جنگ کرو ان اہل کفر سے جو تم سے قریب ہیں۔ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے (اس لیے اس سے ڈرتے رہو)۔

آیت کے الفاظ عام ہیں، لیکن اس سے سرحدوں کی حفاظت کے سلسلے میں بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی ریاست کے خلاف کوئی دشمن طاقت جنگ کا منصوبہ بنائے یا اس پر حملہ آور ہو تو اسلامی ریاست پوری قوت سے اس کا مقابلہ کرے گی۔ یہ اپنے دفاع کے لیے اس کی جنگ ہوگی اور اس کے لیے تیاری کو دفاعی تیاری کہا جائے گا۔

قرآن مجید میں جنگ کی تیاری کے ذیل میں 'رباط' اور 'مرابطہ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان الفاظ کے معنیٰ ہیں جنگی مقاصد کے لیے گھوڑوں کو تیار کرنا۔ ان میں دوطرفہ عمل اور مسابقت کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ الفاظ سرحد کی حفاظت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ سرحد پر دونوں طرف فوج تیار ہوتی ہے اور دشمن کے حملوں کا اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔[1]

جنگی تیاری کے سلسلے میں سورۂ انفال کی آیت (٦٠) کا حوالہ گزر چکا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ ''اور تیار رکھو ان کے لیے جس حد تک تم سے ہو سکے (فوجی) قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے، جس سے اللہ اور تمھارے دشمن پر خوف طاری رہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ (آل عمران: ٢٠٠)	اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور جڑے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ امید ہے تم فلاح پاؤ گے۔

علامہ زمخشریؒ نے رَابِطُوْا کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

أقيموا في الثغور رابطين خيلكم فيها، مترصدين مستعدين للغزو.[2]	سرحدوں پر قیام کرو، وہاں اپنے گھوڑوں کو تیار رکھو، گھات لگائے بیٹھو اور جنگ کے لیے تیار رہو۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ملا علی قاری، مرقاۃ المصابیح: ۲۵۷/۷

[2] زمخشری، الکشاف: ۴۴۹/۱

احادیث میں 'رباط' کی بڑی فضیلت وارد ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد سنا ہے:

رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُهُ، وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الْفَتَّانَ [1]

سرحد پر ایک دن اور رات کا قیام ایک مہینہ کے روزوں اور اس کی راتوں کے قیام سے بہتر ہے۔ اگر اس میں آدمی کی موت واقع ہو جائے تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کرتا رہا ہے، اس پر اس کا رزق جاری رہے گا اور وہ (قبر کے) فتنہ سے مامون رہے گا۔

ایک اور حدیث حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلَى عَمَلِهِ إِلَّا الَّذِي مَاتَ مُرَابِطًا فِي سَبِيلِ اللهِ فَإِنَّهُ يُنْمَى لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ، وَيَأْمَنُ مِنْ فِتْنَةِ القَبْرِ [2]

ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے، سوائے اس شخص کے جو اللہ کے راستے میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے۔ اس کے عمل میں روز قیامت تک اضافہ کیا جاتا رہتا ہے اور وہ قبر کے فتنے سے محفوظ رہتا ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ کہتے ہیں کہ جہاد ہی کے حکم میں 'رباط' بھی ہے۔ یہ ایسی جگہ قیام کو کہا جاتا ہے جہاں سے دشمن کے حملے کا امکان ہے۔ یہ قیام اللہ کی رضا کی خاطر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد علامہ ابن الہمامؒ نے ان احادیث کا ذکر کیا ہے جو رباط کی فضیلت کے سلسلے میں مروی ہیں۔ [3]

افرادی طاقت

جنگی تیاری کے سلسلے میں قرآن مجید نے اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کا جہاں ذکر کیا

---

[1] مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضل الرباط فی سبیل اللہ عز وجل۔

[2] ترمذی: کتاب فضائل الجہاد، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطا۔ ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب فی فضل الرباط۔

[3] ابن الہمام، فتح القدیر: ۵/ ۱۹۴

ہے وہیں افرادی طاقت (Man power) کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہد میں افراد خود ہی جنگی تیاری کرتے تھے۔ دشمن کے مقابلے اور اپنی دفاع کے لیے ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ قرآن نے ان کی تیاری کا رخ موڑ دیا اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہنے اور اس کا تقاضا ہو تو تنگی، ترشی، سختی، آسانی، سہولت اور عدم سہولت ہر حال میں نکل پڑنے کا حکم دیا:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (التوبۃ: ۴۱)	نکل پڑو، (ساز و سامان کے لحاظ سے) خواہ ہلکے ہوں یا بوجھل۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اگر تم اسے جان لو۔[۱]

کم زور ایمان والے اور منافقین اس معاملے میں پس و پیش کرتے تھے۔ انہیں سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ اگر تم اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے تیار نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ دوسروں سے یہ خدمت لے گا اور تم اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (التوبۃ: ۳۸، ۳۹)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے اللہ کے راستے میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو زمین سے چپکے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی سے خوش ہو؟ حالاں کہ دنیا کی زندگی کا ساز و سامان آخرت کے مقابلے میں بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---

[۱] خِفَافًا وَّ ثِقَالًا کے بہت سے مفہوم بیان ہوئے ہیں۔ امام رازیؒ اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں کہ جہاد کے لیے نکل پڑو، چاہے تمہارے لیے آسان ہو یا مشکل۔ تفسیر کبیر: ج ۸، جزء ۱۶، ص ۵۶

کہا گیا کہ منافقین جہاد کے لیے کسی طرح آمادہ ہی نہ تھے، ورنہ اس غفلت اور کاہلی کا مظاہرہ نہ ہوتا۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ۝ (التوبۃ:۴۶)

اگر وہ جہاد کے لیے نکلنا چاہتے تو اس کے لیے سامان تیار کرتے، لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا اور کہا گیا کہ بیٹھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔

جنگ کے لیے افرادی طاقت کتنی ہو، اس کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوگا۔ اس معاملے میں اسلام نے اصولی ہدایت یہ دی ہے کہ افرادی قوت میں فریقین کے درمیان ایک حد تک توازن ضروری ہے۔ غیر معمولی عدم توازن ہو تو کامیابی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ چناں چہ جب مسلمان تعداد میں بہت تھوڑے تھے، لیکن ان کے اندر ایمانی جوش وجذبہ، صبر وثبات اور استقامت کی کیفیت فزوں تر تھی، تو حکم تھا کہ تمہارا حریف اگر دس گنا بھی ہے تو حوصلہ اور ہمت نہ ہارو۔ صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۝ (الانفال: ۶۴، ۶۵)

اے نبی! اللہ تمہارے لیے کافی ہے اور جو اہلِ ایمان تمہاری اتباع کررہے ہیں (وہ کافی ہیں) اے نبی! اہل ایمان کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر (ایسے) سو ہوں گے تو ہزار اہل کفر پر غلبہ پائیں گے۔ اس لیے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے (کہ اللہ کی راہ میں جان دینا کتنی بڑی سعادت ہے)۔

اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اہل ایمان کے اندر صبر وثبات ہو تو وہ اپنے سے دس گنا طاقت ور حریف کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ وہ بیس ہوں تو دوسو پر اور سو ہوں تو ہزار پر غلبہ پاسکتے ہیں۔ اس لیے انہیں دس گنا طاقت سے بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ لیکن یہ حکم خاص حالات میں تھا، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبائل کے حملوں کو روکنے کے لیے مختلف اطراف وجوانب

میں چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیجنے پڑتے تھے اور بعض اوقات بڑی قبائلی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔[1] لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اہل ایمان کو اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈالا گیا، اس حکم میں تخفیف کر دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال:٦٦)

اب اللہ نے اس معاملہ میں تم پر تخفیف کر دی ہے اور یہ جان لیا ہے کہ تمہارے اندر ضعف اور کم زوری ہے۔ لہٰذا اگر تم میں سے سو، ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں (ایسے) ہزار ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ میدانِ جنگ میں استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا جائے اور اس بات کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے کہ آدمی مقابلے سے پیچھے ہٹے اور دشمن کو پیٹھ دکھائے، سوائے اس کے کہ جنگی حکمت عملی اس کا تقاضا کر رہی ہو۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (الانفال:١٥، ١٦)

اے ایمان والو! جب فوج کشی کے موقع پر تمہارا ان لوگوں سے سامنا ہو جنہوں نے کفر کیا ہے تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ، جس کسی نے اس دن انہیں اپنی پیٹھ دکھائی، سوائے اس کے کہ وہ جنگ کی کوئی تدبیر کرنا چاہے یا اپنی فوج کے کسی حصہ کی طرف آنا چاہے، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

حدیث میں میدانِ جنگ سے فرار کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجتنبوا السبع

---

[1] رازی: التفسیر الکبیر، ج۸، جزء۱۵، ص ۱۵۴

الموبقات (سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو) ان میں سے ایک گناہ آپ نے یہ بتایا: والتولّی یوم الزحف (جنگ کے روز پیٹھ پھیرنا)۔ [۱]

سورۂ انفال کی آیت (۶۱) اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں بشارت دی گئی ہے کہ دشمن کی تعداد دو چند ہو تو بھی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلبہ عطا کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخالف فوج دگنی ہو تو بھی مسلمانوں کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دوگنی سے زیادہ فوج سے مقابلہ ہو تو کیا اسلامی فوج کا پسپائی اختیار کرنا غلط اور گناہ کا باعث ہوگا؟ علماء نے اس کے قانونی اور اخلاقی پہلو سے بحث کی ہے۔ علاّمہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ اہل ایمان جنگ میں پشت نہ دکھائیں۔ یہ حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ حریف کی تعداد دگنی سے زیادہ نہ ہو۔ اس صورت میں اہلِ ایمان کے لیے فرض ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار نہ اختیار کریں، لیکن اگر فریق مخالف تعداد میں دوگنے سے زیادہ ہو تو پسپائی اختیار کرنا جرم نہ ہوگا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص دو کے مقابلے میں بھاگ کھڑا ہو تو اس نے فرار کی راہ اختیار کی۔ اگر وہ تین سے فرار اختیار کرتا ہے تو اسے فرار نہیں کہا جائے گا۔ مطلب یہ کہ وہ فرار کی وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔

بعض حضرات نے اس معاملے میں تعداد ہی کا نہیں، ضعف و قوت، اسلحہ، سامانِ جنگ اور مہارت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس لحاظ سے سو گھڑسوار کا فریق مخالف کے سو گھڑسوار سے پیچھے ہٹ جانا جائز ہوگا، اگر وہ ان پہلوؤں سے دگنی سے زیادہ طاقت رکھتا ہو۔ لیکن جمہور کی رائے یہی ہے کہ میدانِ جنگ سے فرار کا جواز اسی وقت ہے جب کہ حریف کی تعداد دگنی سے زیادہ ہو، ورنہ نہیں۔ بڑی سے بڑی فوج کے مقابلے میں

---

[۱] بخاری: کتاب الوصایا، ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلما۔ مسلم: کتاب الایمان، باب بیان الکبائر واکبرھا۔

ثابت قدمی بہر حال پسندیدہ ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے سے دو چند بلکہ سہ چند فوج کا مقابلہ کیا ہے۔[1]

علامہ بغویؒ اکثر اہل علم کی رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

أَنَّ الْمُسْلِمِينَ إِذَا كَانُوا عَلَى الشَّطْرِ مِنْ عَدُوِّهِمْ لَا يجوز لهم أن يفرّوا ويوّلوا ظُهُورَهُمْ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ، وَإِنْ كَانُوا أَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ جَازَ لَهُمْ أَنْ يُوَلُّوا ظُهُورَهُمْ وَيَنْحَازُوا عَنْهُمْ.[2]	اگر مسلمان اپنے دشمن سے نصف تعداد میں ہوں تو فرار اختیار کرنا اور اسے پیٹھ دکھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی جنگی چال ہو یا اپنے کسی فوجی دستے میں شامل ہونا پیش نظر ہو تو اس کی اجازت ہے۔ اگر وہ نصف سے کم ہوں تو ان کے لیے پیٹھ دکھانا اور ان سے دور نکل جانا جائز ہوگا۔

یہ ایک قانونی بحث ہے کہ لڑائی کے میدان سے پسپائی اختیار کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اس کا جواز ہے تو کن حالات میں ہے؟ جنگ میں اس کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ جذبۂ جہاد کے منافی نہیں ہے۔ مومن میدان کارزار میں جان ہتھیلی پر لے کر جاتا ہے اور شہادت کو عین سعادت تصور کرتا ہے۔ اس کا کرّوفر اور اس کا آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا سب کچھ حکمت عملی کے تحت ہوگا۔ بزدلی کا پہلو اس میں قطعاً نہ ہوگا۔ اس کا ایمان و یقین اور اس کا جذبۂ صادق ہی اس کا اصل سرمایہ ہے۔ اس سے وہ بڑی سے بڑی حریف طاقت پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور حاصل کرتا رہا ہے۔ یہی حقیقت قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِإِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (البقرۃ: ۲۴۹)	بارہا ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ج ۴، جزء ۷، ص ۲۴۱

[2] بغوی: معالم التنزیل، نیز ملاحظہ ہو خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۲۱/۳۔ اس موضوع پر مزید بحث کے لیے رجوع کیا جائے۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۸۶/۱۳ اور اس سے آگے۔

قرآن نے جنگ کی تیاری کی جو ہدایات دی ہیں اور احادیث میں ان کی جو تفصیلات آئی ہیں انہیں یہاں پیش کیا گیا ہے۔ جنگ کی تیاری کس نوعیت کی ہو؟ اس کا تعلق زمان ومکان اور حالات سے ہے۔ البتہ ریاست کا تحفظ ضروری ہے۔ اس کے لیے وہ لازمی اقدامات کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عسکریت پسندی اور دہشت گردی ہے؟ کیا یہ نوعِ انسانی کے خلاف کوئی خفیہ منصوبہ اور سازش ہے؟ اگر اسلامی ریاست پر یہ الزام عائد ہوسکتا ہے تو دنیا کی کوئی بھی ریاست اس سے بری نہیں قرار دی جاسکتی۔

ریاست کے لیے فوج کی اہمیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی حکومت کے لیے فوجی یا عسکری طاقت ضروری ہے۔ وہ اس کی توانائی کا بڑا ذریعہ اور اس کے بقا کی ضمانت ہے۔ اس کے بغیر اس کا وجود ہی خطرے میں رہے گا۔ فوج ریاست کے داخلی فتنوں اور ہنگاموں کو فرو کرتی اور بیرونی حملوں سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ موجودہ دور میں بعض فلاحی اور رفاہی کاموں میں بھی وقت ضرورت اس سے مدد لی جاتی ہے، وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ خدمات انجام دیتی ہے۔ اس کے لیے اسے خاص طرح کی تربیت دی جاتی ہے، مسلح کیا جاتا ہے، اس کی ہمت افزائی ہوتی ہے، اس کے حوصلے بلند رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کو جائز بلکہ قومی اور ملکی مفاد میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام جب اللہ کے دین کی سربلندی اور اسلامی ریاست کی حفاظت کو جہاد کہتا ہے، اس کی ترغیب دیتا اور اسے کارِ ثواب قرار دیتا ہے؟ تو اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوجاتی ہے کہ اسلام خوں ریزی کی تعلیم دیتا اور اپنے ماننے والوں کو خون آشامی کا چسکا لگاتا ہے۔

مقاصدِ جہاد

جہاد کا حکم کس لیے ہے اور اسلامی ریاست کس مقصد کے لیے جہاد کرے گی؟ اس کا جاننا ضروری ہے۔ اسی سے جہاد اور دوسری جنگوں کا فرق واضح ہوگا، ورنہ اسے بھی دنیا کی دوسری جنگوں کی طرح کی ایک جنگ سمجھا جائے گا، جن کا مقصد دوسروں کو غلام بنانا اور اپنا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کی ظالم اور جابر قومیں اس قسم کی جنگیں کرتی رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے جنگ کی اجازت ناحق خوں ریزی اور قتل و غارت گری کے لیے دی ہے؟ یا یہ کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے ہے؟ کیا اس کے کچھ حدود و قیود ہیں یا یہ ہر قاعدہ و ضابطہ اور بندش سے آزاد ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ

اسلام نے جس جنگ کا حکم دیا ہے اسے وہ مطلق جنگ یا قتال نہیں کہتا، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔ اسے وہ ایمان کی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات: ۱۵)

مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے اموال اور انفس کے ذریعے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہی سچے (ایمان والے) ہیں۔

اس جنگ کو وہ 'قتال فی سبیل اللہ' بھی کہتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ: ۲۴۴)	اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ایک جگہ اس کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (البقرۃ: ۱۹۰)	اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں ان سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اعلاءِ کلمۃ اللہ

قتال فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ اس جنگ کو کہا جاتا ہے جو اپنے ذاتی مفاد یا کسی اور کو فائدہ پہنچانے یا ایک کے ہاتھ سے زمامِ حکومت چھیننے اور دوسرے کو تختِ اقتدار پر فائز کرنے کے لیے نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری غرض اس میں شامل نہ ہو۔ اسے اعلاء کلمۃ اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ابھی سورۂ بقرہ کی آیت (۱۹۰) کا حوالہ گزر چکا ہے، جس میں 'قتال فی سبیل اللہ' کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے تحت علامہ زمخشریؒ نے قتال فی سبیل اللہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

المقاتلة في سبيل الله: هو الجهاد لإعلاء كلمة الله وإعزاز الدين [1]	قتال فی سبیل اللہ اس جہاد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور دین کے اعزاز و توقیر کے لیے ہو۔

اسی آیت کے ذیل میں قاضی بیضاویؒ کے الفاظ ہیں:

جاهدوا لإعلاء كلمته وإعزاز دينه. [2]	جہاد کرو اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور اس کے دین کی عزت و وقار کے لیے۔

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۲۳۳

[2] بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/ ۱۰۸

جنگ اللہ کی رضا کے لیے

اس جنگ میں جو اخلاص مطلوب ہے، امام رازیؒ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَيْ فِي طَاعَتِهِ وَطَلَبِ رِضْوَانِهِ [1]

جنگ کرو اللہ کے راستے میں، یعنی اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کی خوش نودی کی طلب میں۔

جس جہاد کا حکم ہے اسے قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ جنگ جو اللہ کے راستے میں ہو۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین اور شریعت ہے۔ یہی وہ راستہ ہے، جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں فلاح یاب ہوسکتا ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسیؒ نے جہاد کا مقصد اور فی سبیل اللہ کی معنویت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

وَالظَّاهِرُ أَنَّ المقاتلة في سبيل الله هِيَ الْجِهَادُ فِي الْكُفَّارِ لِإِظْهَارِ دِينِ اللَّهِ وَإِعْلَاءِ كَلِمَتِهِ. السَّبِيلُ هُوَ الطَّرِيقُ، وَاسْتُعِيرَ لِدِينِ اللَّهِ وَشَرَائِعِهِ، فَإِنَّ الْمُتَّبِعَ ذَلِكَ يَصِلُ بِهِ إِلَى بُغْيَتِهِ الدِّينِيَّةِ وَالدُّنْيَوِيَّةِ، فَشُبِّهَ بِالطَّرِيقِ الْمُوَصِّلِ الْإِنْسَانَ إِلَى مَا يَقْصِدُهُ [2]

قتال فی سبیل اللہ سے، بہ ظاہر کفار اور منکرین سے جہاد مراد ہے جو اظہارِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ہو... سبیل کے معنیٰ راستے کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس راستہ پر چلنے والا اپنے دینی اور دنیوی مقصد تک پہنچتا ہے۔ اس لیے اسے اس راستے سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے مقصد تک اس کی رسائی کا ذریعہ ہے۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

أي جاهدوا لإعزاز دين الله تعالى وإعلاء كلمته- فالسبيل- بمعنى الطريق

یعنی جہاد کرو، اللہ تعالیٰ کے دین کے اعزاز واکرام اور اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے۔ لفظ سبیل، راستے کے معنیٰ

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر: ج ۳، جزء ۵ ص ۱۰۹

[2] ابوحیان، البحر المحیط: ۲/ ۷۲، ۷۳

مستعار لدین الله تعالی وکلمته لأنه یتوصل المؤمن به إلی مرضاته تعالی[1]	میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے کلمے کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ اسی کے ذریعے سے مومن اللہ تعالیٰ کی مرضیات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ اور اہلِ علم کی تشریحات سے واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اس جنگ کا نام ہے جو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی سربلندی کے لیے ہو۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس کا مقصد دین اور شریعت کا نفاذ ہو۔ جہاد کے اس نصب العین نے، خاندانی، قبائلی، نسلی اور وطنی جنگوں کو غلط اور باطل قرار دیا ہے۔ اس کی رو سے ہر وہ جنگ جو اس پاکیزہ نصب العین کے لیے نہ ہو، کفر کی جنگ اور 'فی سبیل الطاغوت' ہے۔ اسلام اس طرح کی جنگ کے خلاف ہے اور طاقت سے اسے روکنا چاہتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ إِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفاً ○ (النساء:۷٦)	وہ لوگ جو ایمان والے ہیں اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ 'طاغوت' کے راستے میں لڑتے ہیں، لہٰذا تم شیطان کے حمایتیوں سے جنگ کرو۔ بے شک شیطان کی تدبیر کم زور ہے۔

مقصدِ جہاد کی وضاحت

جہاد جس پاک جذبہ اور پاک مقصد کے تحت ہونا چاہیے، اسے احادیث میں بہ خوبی واضح کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! (قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ اس لیے کہ) ایک شخص غنیمت کی خاطر جنگ کرتا ہے، ایک شخص ریاکاری کے جذبے سے جنگ لڑتا ہے، اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا ذکر اور چرچا ہو۔

---

[1] آلوسی، روح المعانی: ۲/ ۷۰ ۴

ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی پامردی اور ثابت قدمی لوگ دیکھ سکیں۔ (ایک روایت میں ہے کہ) ایک شخص اپنا غصہ نکالنے کے لیے لڑتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص قومی یا قبائلی حمیت کے تحت لڑتا ہے۔ ان میں سے کس شخص کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا جائے گا؟ آپ نے اُن میں سے ایک ایک بات کا جواب دینے کی جگہ مقصدِ جہاد کو چند جامع کلمات میں بیان فرمادیا:

مَنِ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ[1]

جس کسی نے اس لیے جنگ کی کہ اس سے اللہ کا کلمہ بلند ہو تو اس کی جنگ فی سبیل اللہ (یعنی اللہ کے راستے میں) ہوگی۔

امام نوویؒ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وَأَنَّ الْفَضْلَ الَّذِي وَرَدَ فِي الْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَخْتَصُّ بِمَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هي العليا[2]

مجاہدین فی سبیل اللہ کی فضیلت جو احادیث میں آئی ہے وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو صرف اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے جنگ کریں۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ضمانت لیتا ہے اور اپنے اوپر واجب قرار دیتا ہے کہ جو شخص اس کے راستے میں نکلے، اس کے پیش نظر صرف اس کے راستے میں جہاد ہو، وہ اس پر ایمان رکھتا اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرتا ہو تو وہ اسے جنت میں داخل کرے گا یا اسے اس کے گھر لوٹائے گا اس اجر و ثواب اور غنیمت کے ساتھ جو اسے ملا ہے۔[3]

---

[1] بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔ نیز ملاحظہ ہو، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابواب الجہاد

[2] شرح مسلم: ج ۷، جزء ۱۳، ص ۴۳۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جہاد کا حقیقی اور اصل محرک تو اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہونا چاہیے، ہاں اگر ضمناً دوسری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اس سے ثواب میں فرق واقع نہ ہوگا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۶/ ۱۰۹-۱۱۰

[3] بخاری: کتاب الایمان، باب الجہاد من الایمان۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ

حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آدمی جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ کرتا ہے، لیکن وہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز چاہتا ہے۔ (کیا وہ مستحقِ اجر ہے؟) آپؐ نے فرمایا: لَا اجر لہٗ۔ اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ یہ تو بہت دشوار امر ہے۔ اس شخص سے کہا کہ تم شاید اپنی بات سمجھا نہ سکے، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دوبارہ پیش کرو۔ اس نے اپنی بات دوبارہ کہی کہ اے اللہ کے رسول! آدمی جہاد کرتا ہے اور دنیا کے ساز وسامان میں سے کوئی چیز چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: لَا اجر لہٗ۔ اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ لوگوں کے کہنے پر اس شخص نے تیسری بار یہی سوال کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔[1]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غزوات دو طرح کے ہوتے ہیں: جو شخص اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے، امام کی اطاعت کرے، اپنی بہترین چیز (جان اور مال) خرچ کرے، اپنے ہم سفر کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے اور فساد سے بچا رہے تو اس کے سونے اور جاگنے ہر چیز کا ثواب ہے۔ لیکن جس شخص کی جنگ، فخر، ریا کاری اور شہرت کے لیے ہو، وہ امام کی نافرمانی کرے اور زمین میں فساد مچائے تو وہ برابر سرابر بھی نہیں لوٹے گا (جس حالت میں گیا تھا اس سے برے حال میں واپس ہوگا)۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ أخبرنی عن الجهاد و الغزو مجھے جہاد اور غزوے (کی فضیلت) بتایئے آپ نے ارشاد فرمایا: اے عبداللہ بن عمروؓ! اگر تم نے جہاد میں صبر وثبات کا مظاہرہ کیا،

---

[1] ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔

[2] ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔ نسائی: کتاب الجہاد، باب فضل الصدقہ فی سبیل اللہ۔

ثواب کی خاطر اس میں شرکت کی تو اللہ تعالیٰ تمھیں صابر اور محتسب (طالبِ ثواب) کی حیثیت سے اٹھائے گا۔ لیکن اگر تم نے ریاکاری کے لیے یا مال و دولت میں اضافے کے لیے جنگ کی تو اللہ تعالیٰ ریاکار اور طالب مال کی حیثیت سے اٹھائے گا۔ اے عبد اللہ بن عمرو! جس جذبہ اور کیفیت کے ساتھ تم نے جنگ کی اور مارے گئے، اللہ تعالیٰ اسی جذبہ اور کیفیت کے ساتھ تمھیں اٹھائے گا۔[1]

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جنگ کی اور اس کی نیت صرف ایک چھوٹی سی رسّی کی تھی تو اسے وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی۔[2]

یہ ہے جہاد یا قتال فی سبیل اللہ۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اس کی رضا اور خوش نودی کے لیے لڑی جاتی ہے۔ جو جنگ ذاتی اغراض، جذبۂ شہرت یا قبائلی اور قومی مفادات کے لیے ہو دنیا کی نظر میں اس کی جو بھی قدر و قیمت ہو، جہاد فی سبیل اللہ نہ ہوگی اور وہ اس کے اجر و ثواب کی مستحق نہ قرار پائے گی۔

---

[1] ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔

[2] نسائی: کتاب الجہاد، باب من غزا فی سبیل اللہ ولم ینو من غزاتہ الّا عقالاً۔ مسند احمد: ۶/۳۲۰، ۳۲۷، ۳۵۱۔

فتنہ ختم ہو
مذہبی آزادی باقی رہے

فتنہ نہ رہے

جہاد کا ایک مقصد فتنے کا مقابلہ کرنا اور اسے ختم کرنا ہے۔ یہ مقصد قریش اور اہلِ مکہ سے جنگ کے حکم کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ کَذٰلِكَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ○ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ○ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ

اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں ان سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ انھیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا تھا اور فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مسجد حرام کے پاس ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس میں تم سے جنگ نہ کریں۔ پس اگر وہ تمھیں قتل کرنے کے لیے بڑھیں (جنگ کریں) تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ لیکن اگر وہ جنگ سے باز آ جائیں تو اللہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ وہ اگر اس سے رک جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہ ہوگی۔ حرمت کا مہینہ (اس میں اگر تمھیں جنگ کرنی پڑے تو) اس حرمت کے مہینے کا بدلہ ہے (جس میں اس سے پہلے مشرکین نے تمھارے ساتھ زیادتی کی

اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○

تھی) حرمتیں تو سب کے لیے برابر ہیں۔ لہٰذا جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو اس کا اتنا جواب دو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

(البقرۃ: ۱۹۰-۱۹۴)

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور اس کا پس منظر بھی بیان ہوا ہے کہ مشرکینِ قریش نے مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے، گھر سے بے گھر ہونے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ حرم میں انہیں داخل ہونے اور خانۂ کعبہ میں اللہ کی عبادت سے روکا۔ بعد میں مستقل حالتِ جنگ قائم کردی اور عملاً جنگ کرتے رہے۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں جنگ کا حکم دیا گیا اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ آئندہ یہ صورتِ حال باقی نہ رہے اور دشمن کی قوت پوری طرح ختم کردی جائے۔ اس سلسلے میں ہدایت کی گئی کہ ان مشرکین سے حدودِ حرم میں جنگ سے احتراز کیا جائے۔ اگر وہ اس کی پاس داری نہ کریں اور تلوار اٹھالیں تو ان کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اگر وہ حدودِ حرم کا احترام کریں اور جنگ سے باز آجائیں تو ان سے ہاتھ روک لیا جائے۔ یہ بات اسی پسِ منظر کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ

وہ تم سے ماہِ حرام میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کے راستے سے باز رکھنا، اس کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام کی زیارت سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور 'فتنہ' قتل سے بہت بڑا (جرم) ہے۔ وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان سے ہوسکے تو تمہیں تمہارے دین ہی سے پھیر دیں۔ اگر تم میں سے کوئی اپنے

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۱۷)	دین سے پھر جائے اور اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ کافر ہے تو اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں رائگاں جائیں گے، یہ لوگ جہنم والے ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

مفسرین کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللہِ الَّذِیْنَ یُقٰتِلُوْنَکُمْ الآیۃ (۱۹۰) میں پہلی بار مشرکین سے جنگ کا حکم دیا گیا۔ علاّمہ ابوحیان اندلسیؒ کہتے ہیں:

وَأَكْثَرُ عُلَمَاءِ التَّفْسِيرِ عَلَى أَنَّهَا أَوَّلُ آيَةٍ نَزَلَتْ فِي الْأَمْرِ بِالْقِتَالِ[۱]	بیش تر علماء تفسیر کا خیال ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم کے ساتھ نازل ہوئی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں سے جنگ کا حکم دیا گیا جو عملاً جنگ کر رہے ہیں۔ جو جنگ میں شریک نہ ہوں ان کے خلاف اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن بعد کی آیات یا سورۂ توبہ کی آیت ۵ میں تمام مشرکینِ قریش سے جنگ کا حکم دیا گیا، چاہے وہ جنگ کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اس طرح یہ حکم منسوخ ہو گیا۔[۲]

---

۱ ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۷۳۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ کے سلسلے میں سب سے پہلے سورۂ حج کی آیت اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ (الحج:۳۹) نازل ہوئی۔ لیکن امام قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ جہاد کا حکم سورۂ بقرہ کی ان ہی آیات میں دیا گیا (قرطبی: ج۱، جزء۲، ص ۳۴۲) بہ ظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورۂ حج کی آیت میں جنگ کی اجازت دی گئی اور سورۂ بقرہ کی ان آیات میں برسرِ پیکار مشرکین سے جنگ کا حکم دیا گیا۔

۲ جلالین میں ہے: هٰذا منسوخ بآیة براءة او بقوله وَ اقْتُلُوْهُمْ الآیۃ (ص۳۹، ۴۰) یہی بات بعض اور مفسرین نے بھی کہی ہے۔ اس میں سورۂ توبہ کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ الآیۃ یعنی جب محترم مہینے نکل جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اس کے پس منظر سے ان شاء اللہ آئندہ بحث ہوگی۔

یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ آیات ایک ہی سلسلۂ کلام میں آئی ہیں اور یہ بات کچھ عجیب سی ہوگی کہ پہلی آیت کے حکم کو دوسری آیت منسوخ کر دے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: اسے منسوخ ماننے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لیے کہ پہلی آیت میں وَلَا تَعْتَدُوْا (اور تم زیادتی نہ کرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں وہ امور بھی داخل ہیں جن کا ذکر بعد کی آیات میں آیا ہے، یعنی حدودِ حرم میں ان سے جنگ نہ کی جائے اور ان تمام باتوں سے احتراز کیا جائے، جن کی حالتِ جنگ میں ممانعت ہے۔[1]

علامہ ابوحیان اندلسیؒ بھی اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، دوسری آیت میں اس سے آگے کا حکم ہے۔ فرماتے ہیں: بعد کی آیات میں وَاقْتُلُوْهُمْ (اور انہیں قتل کرو) سے مراد وہی لوگ ہیں، جن سے پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔[2]

علامہ شیخ محمد عبدہؒ نے اس رائے پر سخت تنقید کی ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کی ناسخ ہے اور کہا ہے کہ یہ آیات باہم مربوط ہیں۔ انہیں اس طرح تقسیم نہیں کیا جاسکتا:

إِنَّ هَذِهِ الْآيَاتِ نَزَلَتْ مَرَّةً وَاحِدَةً فِي نَسَقٍ وَاحِدٍ وَقِصَّةٍ وَاحِدَةٍ فَلَا مَعْنَى لِكَوْنَ بَعْضِهَا نَاسِخًا لِلْآخَرِ[3]	اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیات ایک ہی مرتبہ نازل ہوئیں۔ وہ ایک ہی سلسلۂ کلام اور ترتیب میں واقع ہوئی ہیں اور ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، لہٰذا اس کے کوئی معنی نہیں کہ ان میں سے بعض آیتیں بعض کی ناسخ ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آیات کے اس مجموعے میں جنگ کے حکم سے پہلے اس کے اصول و آداب بیان ہوئے ہیں کہ جنگ ان ہی سے ہوگی جو میدانِ جنگ میں مقابلے

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر: ج ۳، جزء ۵، ص ۱۰۹–۱۱۰

[2] ابوحیان، البحر المحیط: ۲/ ۷۳

[3] تفسیر القرآن الحکیم، (تفسیر المنار): ۲/ ۲۱۰

کے لیے آئیں۔ عام شہری آبادی کو، جو جنگ سے عملاً دور ہے، نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور ان افراد پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا جو جنگ سے غیر متعلق ہیں۔[1]

ان آیات میں جنگ کے جواز کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے) فتنے کے معنیٰ ہیں سونے چاندی کو آگ میں تپانا۔ اسی سے کسی انسان کو سخت تکلیف اور اذیت دینے، ابتلا اور آزمائش میں ڈالنے کا تصور ابھرا ہے۔ امام راغبؒ کہتے ہیں:

أصل الفَتْنِ: إدخال الذّهب النار لتظهر جودته من رداءته، واستعمل في إدخال الإنسان النار.[2]	فتن کے اصل معنیٰ ہیں سونے کو آگ میں ڈالنا، تا کہ خالص سونا کھوٹے سے نمایاں ہو جائے اور اس کا استعمال انسان کو آگ میں ڈالنے کے معنیٰ میں (بھی) ہونے لگا۔

لسان العرب میں ازہری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے:

جِماعُ مَعْنَى الفِتْنة الابْتِلَاءُ والامْتِحانُ وَالِاخْتِبَارُ، وأَصلها مأْخوذ مِنْ قَوْلِكَ فتَنْتُ الْفِضَّةَ وَالذَّهَبَ إِذا أَذبتهما بِالنَّارِ لِتُمَيِّزَ الرَّدِيءَ مِنَ الجيِّدِ[3]	فتنہ کے معنیٰ کا خلاصہ ہے ابتلاء، امتحان اور آزمائش۔ اس کی اصل اس استعمال سے ماخوذ ہے جو آپ کرتے ہیں فتنت الفضة و الذهب جب آپ چاندی اور سونے کو آگ میں پگھلائیں تا کہ عمدہ اور ردّی الگ ہو جائے۔

امام رازیؒ کہتے ہیں:

---

[1] جنگ میں جن لوگوں پر ہاتھ اٹھانے کی ممانعت ہے، حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' عنوان 'جنگ کے آداب' ص ۲۱۰ تا ۲۱۴ طبع چہارم۔ علامہ ابوحیان اندلسیؒ نے البحر المحیط: ۷/ ۳۷ میں اس پر مختصر سی بحث کی ہے اور علامہ قرطبیؒ نے اس مسئلہ میں فقہا کے خیالات کی بھی کسی قدر وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱، جزء ۲، ص ۲۳۲-۲۳۳

[2] مفردات القرآن: ص ۳۷۴

[3] ابن منظور، لسان العرب: مادہ 'فتن' ۱۳/ ۳۱۷

أَنَّ الْفِتْنَةَ أَصْلُهَا عَرْضُ الذَّهَبِ عَلَى النَّارِ لِاسْتِخْلَاصِهِ مِنَ الْغِشِّ، ثُمَّ صَارَ اسْمًا لِكُلِّ مَا كَانَ سَبَبًا لِلِامْتِحَانِ تَشْبِيهًا بِهَذَا الْأَصْلِ[۱]

فتنہ کی اصل ہے سونے کو آگ میں ڈالنا، تاکہ اسے میل کچیل سے پاک کیا جائے۔ پھر اس اصل سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ ہر اس چیز کا نام ہو گیا جو امتحان اور آزمائش کا سبب بن جائے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ فتنہ کے معنیٰ دراصل کسی کو سخت آزمائش میں ڈالنے اور تکلیف اور اذیت سے دوچار کرنے کے ہیں۔ اسی کو یہاں قتل سے شدید تر کہا گیا ہے۔ چناں چہ زمخشریؒ "وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" کے ذیل میں کہتے ہیں:

أی المحنة والبلاء الذي ينزل بالإنسان يتعذب به أشد عليه من القتل.[۲]

وہ آزمائش اور مصیبت، جو انسان پر نازل ہو، جس سے وہ عذاب میں مبتلا کیا جائے، قتل سے بھی شدید تر ہے۔

بیضاویؒ میں آیت کے اس فقرے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

أي المحنة التي يفتتن بها الإنسان، كالإخراج من الوطن أصعب من القتل لدوام تعبها وتألم النفس بها.[۳]

وہ کلفت اور تکلیف جس سے انسان آزمایا جائے جیسے وطن سے نکال باہر کر دینا، قتل سے بھی زیادہ سخت ہے، اس لیے کہ اس کی تکلیف دائمی ہوتی ہے اور نفس اس سے مستقل اذیت محسوس کرتا ہے۔

فتنہ کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہاں فتنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس کے بہت سے معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔[۴] ان سب کا خلاصہ دو نکات میں بیان ہو سکتا ہے:

۱- یہاں فتنے سے مراد قریشِ مکہ کا کفر و شرک ہے۔ اس پر اگروہ جمے ہوئے ہیں

۱۔ رازی، التفسیر الکبیر: جلد ۳، جزء ۵، ص ۱۱۱۔ نیز ملاحظہ ہو رشید رضا، تفسیر المنار: ۲/۲۰۹

۲۔ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۲۳۴

۳۔ بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل: ۱/۱۰۹

۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۷۴

اور حدودِ حرم میں بھی اس کا ارتکاب کر رہے ہیں تو یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اس کی بنا پر ان سے جنگ کی جائے اور وہ مارے جائیں، یا یہ کہ اس میں مسلمان شہید ہوں تو یہ ناروا نہ ہوگا۔ اس کا جواز خود انھوں نے فراہم کر دیا ہے۔[1]

۲- یہاں فتنے سے مراد وہ غلط رویہ ہے جو مشرکین نے اہل ایمان کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے مذہب اور عقیدے کی آزادی ان سے سلب کر لی اور اسلام، جو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین حق ہے اس کے ماننے پر انہیں ہر نوع کی سزا کا مستحق گردانا اور سخت سے سخت اذیت پہنچائی۔ اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ رویہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ اس بات کو امام رازیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

وَالْمَعْنَى: أَنَّ إِقْدَامَ الْكُفَّارِ عَلَى الْكُفْرِ وَعَلَى تَخْوِيفِ الْمُؤْمِنِينَ، وَعَلَى تَشْدِيدِ الْأَمْرِ عَلَيْهِمْ بِحَيْثُ صَارُوا مُلْجَئِينَ إِلَى تَرْكِ الْأَهْلِ وَالْوَطَنِ هَرَبًا مِنْ إِضْلَالِهِمْ فِي الدِّينِ، وَتَخْلِيصًا لِلنَّفْسِ مِمَّا يَخَافُونَ وَيَحْذَرُونَ، فِتْنَةٌ شَدِيدَةٌ بَلْ هِيَ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ الَّذِي يَقْتَضِي التَّخْلِيصَ مِنْ غُمُومِ الدُّنْيَا وَآفَاتِهَا[2]

اس کے معنیٰ ہیں کفار کا کفر پر اقدام اور اہل ایمان کو حالتِ خوف میں مبتلا رکھنا اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا، جس کے نتیجے میں وہ دین کے معاملے میں ان کی گم راہ کن کوششوں سے نجات پانے اور خود کو ان کے خوف سے بچانے کے لیے اپنے اہل وعیال اور وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ شدید فتنہ ہے، بلکہ یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے، جس کے بعد انسان دنیا کے غموں اور آفات سے نجات پا جاتا ہے۔

یہی مفہوم سیاق وسباق کے لحاظ سے صحیح ہے۔ عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کی آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ اس پر پابندی لگانا بہت بڑا جرم اور انتہائی غیر انسانی رویہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ قریش نے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ یہ جنگ اسی کو ختم کرنے کے لیے تھی۔ علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں:

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/ ۲۳۴

[2] رازی، التفسیر الکبیر: ج ۳، جزء ۵، ص ۱۱۱

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" أَيِ الْفِتْنَةُ الَّتِي حَمَلُوكُمْ عَلَيْهَا وَرَامُوا رُجُوعَكُمْ بِهَا إِلَى الْكُفْرِ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ.

فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔ یعنی وہ فتنہ جس میں انھوں نے مسلمانوں کو ڈال رکھا تھا اور جس کے ذریعے وہ یہ چاہ رہے تھے کہ مسلمان کفر کی طرف لوٹ جائیں، قتل سے زیادہ سخت ہے۔

پھر اس کے بعد حضرت مجاہدؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

أَيْ مِنْ أَنْ يُقْتَلَ الْمُؤْمِنُ، فَالْقَتْلُ أَخَفُّ عَلَيْهِ مِنَ الْفِتْنَةِ.[1]

یعنی یہ کہ فتنہ شدید ہے اس بات سے کہ مومن قتل کر دیا جائے، اس لیے کہ فتنہ کے مقابلہ میں قتل اس کے لیے ہلکا ہے۔

یہ درحقیقت اسی فتنے کو ختم کرنے کا حکم ہے جس سے اہل ایمان دو چار تھے اور اپنے عقیدہ اور فکر کی وجہ سے طرح طرح کی ابتلا اور آزمائش سے گزر رہے تھے۔ قرآن نے اس اعلان کے ساتھ یہ جنگ شروع کی کہ جب تک یہ صورتِ حال ختم نہ ہو اور اسلام کو قبول کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل نہ ہو، یہ جنگ جاری رہے گی۔

ان آیات کے آخر میں کہا گیا:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۹۱)

اور جنگ کرو ان سے یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

یہ آیت سورۂ انفال میں بھی ایک لفظ کے اضافے کے ساتھ آئی ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال:۳۹)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ 'فتنہ' نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔

یہاں 'فتنہ' سے عام طور پر شرک مراد لیا گیا ہے۔ یعنی یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ شرک کا فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔ علما کا اتفاق ہے کہ ان آیات کا تعلق مشرکین عرب سے ہے۔ غیر عرب مشرکین

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۱، جزء ۲، ص ۲۳۴

اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے احکام دوسرے ہیں۔ علامہ ابوبکر جصاص حنفیؒ لکھتے ہیں:

”آیت میں مشرکین مکہ کا حال بیان ہوا ہے، جنھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ سے نکالا تھا۔ ان کے بارے میں کہا گیا: ’وَ اقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ‘ (انھیں جہاں پاؤ قتل کرو) اس حکم میں اہل کتاب داخل نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ مشرکین عرب کے لیے دو ہی صورتیں ہیں: یا تو وہ اسلام قبول کریں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔“[1]

کیا جہاد کفر کو مٹانے کے لیے ہے؟

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر اسلامی نظریات، جنھیں اسلام کفر سے تعبیر کرتا ہے ان کو مٹانے کی کوشش کا نام جہاد ہے۔ یہ ایک بے بنیاد خیال ہے۔ اسلام نے جنگ و صلح کے جو اصول بیان کیے ہیں، یہ ان کے سراسر خلاف ہے۔

۱- اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کائنات کا فرماں روائے مطلق ہے۔ لیکن اس نے انسانوں کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ اس نے انسان کو فکر و عمل کی آزادی دی ہے۔ وہ اس آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان اور آزمائش ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ (البقرۃ:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ رسول کی ذمے داری تبلیغ کی ہے۔ فرمایا:

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ○ (النحل:۸۲) اگر یہ منھ موڑتے ہیں تو تمھاری ذمے داری بس واضح طریقے سے پہنچانے کی ہے

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۱/۳۱۶۔ مشرکین عرب اور دیگر اقوام کے درمیان اسلام نے یہ فرق کیوں کیا ہے۔ اس کی کسی قدر وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو ’غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق‘۔ بحث: خانہ کعبہ پر مشرکین کا ناجائز قبضہ۔ مشرکین عرب کا حکم، ص ۲۰۵-۲۰۸

ایک اور موقع پر فرمایا:

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا‌ ؕ اِنۡ عَلَيۡكَ اِلَّا الۡبَلٰغُ‌ ؕ (الشوریٰ:۴۸)

اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تمھیں داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ (انھیں مجبور کرو) تمھاری ذمے داری تو بس پہنچانے کی ہے۔

۲-قرآن وحدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ کفر کا استیصال یا خاتمہ اس کے پیش نظر ہے اور نہ اس بنیاد پر کبھی جہاد کیا گیا۔ جہاں اسلام کو اقتدار حاصل ہوا وہاں غیر مسلموں کو تمام بنیادی حقوق دیے گئے اور انھیں اپنے مذہب پر عمل کی اجازت دی گئی۔

۳- جزیہ کا حکم یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں مخالف نظریات باقی رہیں گے۔

۴-اسلام نے صلح کو جنگ پر مقدم رکھا ہے اور کہا ہے کہ فریقِ مخالف صلح کے لیے آمادہ ہو تو صلح کر لی جائے۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ جہاد یا قتال دشمن کے محاربہ یا جنگ کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے جہاد کے حکم کے ساتھ محاربہ کی قید لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ كَآفَّةً (التوبہ:۳۶)

مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح سب مل کر وہ تم سے لڑتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہماری جنگ ان کی جنگ کی وجہ سے ہے، یا یوں کہا جائے کہ ہماری جنگ کا سبب ان کی جنگ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ (الانفال:۳۹) ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔

وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے جبر واکراہ، زدوکوب اور قتل کے ذریعے پھیر رہے ہیں۔ یہی فتنہ ہے۔ یہ جنگ اس فتنہ کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ اہل مکہ ایمان لانے والوں کو ہر طرح کی اذیت دے رہے تھے، تاکہ وہ دین سے پھر جائیں۔ اسلام نے حکم دیا کہ جنگ کے ذریعے ان کی طاقت ختم کر دی جائے، تاکہ وہ مسلمانوں کو اس فتنہ میں نہ

ڈال سکیں۔[1]

امام ابن تیمیہؒ نے قتال کفر کے موضوع پر ایک بہت ہی علمی اور تحقیقی رسالہ تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی ہے کہ کفار سے جنگ کی بنیاد کفر ہے یا ان کا محاربہ (مسلمانوں سے جنگ)۔ انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ کفر کی وجہ سے جہاد نہیں ہوگا، البتہ اگر وہ جنگ کر رہے ہوں تو اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ علامہ صنعانیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔ اس رسالہ کو علامہ قرضاوی نے اپنی کتاب 'فقہ الجہاد' میں بہ طور ضمیمہ شامل کیا ہے۔ علامہ شوکانیؒ بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ دورِ حاضر کے علماء میں شیخ ابوزہرہؒ اور بعض دوسرے اکابر نے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ قرآن نے جنگی قیدیوں کے بارے میں کہا ہے:

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً — یعنی ان کو رہا کر دیا جائے یہ ان پر احسان ہوگا، یا ان سے فدیہ لیا جائے۔ (محمد: ۴)

اگر کفر باعثِ قتل ہوتا تو ان کو چھوڑا جاتا نہ ان سے فدیہ لیا جاتا۔ فتح مکہ کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اسلام پر مجبور نہیں کیا۔ جس نے اسلام قبول کیا، اپنی مرضی سے کیا۔ اس کے بعض مزید دلائل کا ہم نے دوسری جگہ ذکر کیا ہے۔[2]

مستضعفین کی مدد

اگر کسی غیر اسلامی ریاست میں مسلمان عقیدے اور عمل کی آزادی سے محروم ہیں، اللہ کے دین پر عمل کی وجہ سے انہیں سخت اذیت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور حالات اتنے خراب اور دشوار ہیں کہ وہاں سے وہ ہجرت کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے تو اس

---

[1] ہدایہ مع فتح القدیر: ۴۲۱/۵

[2] علامہ یوسف القرضاوی نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: فقہ الجہاد، جلد اول، ص ۳۹۳-۴۰۳)

صورت میں قرآن مجید نے اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ انہیں ان حالات سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے اسے طاقت بھی استعمال کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ مکہ میں مسلمان اسی صورتِ حال سے دو چار تھے۔ قرآن مجید نے ان کے لیے 'مستضعفین' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ جو قوت اور طاقت سے محروم اور مغلوب ہیں اور جنہیں کم زور اور مجبور کر کے رکھا گیا ہے، ان کے متعلق حکم ہوا:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (النساء:۷۵)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جنگ نہیں کرتے ہو اللہ کے راستے میں اور مستضعفین کے لیے جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل ہیں، جو دعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی ولی و سرپرست پیدا فرما دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار فراہم کر دے۔

اس آیت میں 'قتال فی سبیل اللہ' کے عام حکم کے ساتھ خاص طور پر 'مستضعفین' کا ذکر ہے۔ اس سے ان کو نجات دلانے کے لیے جہاد کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔ علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں:

''یہ وہ مستضعفین (کم زور اور مغلوب افراد) تھے جو مکہ میں اسلام لائے اور جنہیں مشرکین ہجرت کرنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ وہیں دبے اور پسے ہوئے اور کم زور بن کر رہنے پر مجبور تھے۔ مشرکین کی طرف سے ان کو سخت تکلیفیں دی جا رہی تھیں اور وہ ان سے نجات پانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور التجائیں کر رہے تھے کہ ان کی نصرت اور مدد فرمائے۔ چناں چہ اللہ نے ان میں سے بعض کے لیے مدینہ ہجرت کرنا آسان کر دیا اور بعض فتح مکہ تک اذیتیں جھیلتے رہے۔ فتح مکہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے بہترین ولی و ناصر بن کر آئے۔ آپ جب مکہ سے واپس ہوئے تو عتاب بن اسید کو گورنر مقرر کیا۔

انھوں نے آپ کے سچے جانشین کی حیثیت سے ان کی نصرت اور حمایت جاری رکھی اور انہیں ان کے حقوق دلوائے۔[1]

علامہ قرطبیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

حَضٌّ عَلَى الْجِهَادِ. وَهُوَ يَتَضَمَّنُ تَخْلِيصَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنْ أَيْدِي الْكَفَرَةِ الْمُشْرِكِينَ الَّذِينَ يَسُومُونَهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ، وَيَفْتِنُونَهُمْ عَنِ الدِّينِ، فَأَوْجَبَ تَعَالَى الْجِهَادَ لِإِعْلَاءِ كَلِمَتِهِ وَإِظْهَارِ دِينِهِ وَاسْتِنْقَاذِ الْمُؤْمِنِينَ الضُّعَفَاءِ مِنْ عِبَادِهِ، وَإِنْ كَانَ فِي ذَلِكَ تَلَفُ النُّفُوسِ.[2]

یہ جہاد کی ترغیب ہے۔ اس میں ان مستضعفین کو کفار و مشرکین کے پنجۂ ظلم سے چھڑانا بھی شامل ہے جو انہیں بدترین سزا دے رہے تھے اور انہیں دین سے پھیرنے کے لیے فتنے (طرح طرح کی آزمائش) میں ڈال رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کو فرض کیا ہے اپنے کلمے کی سربلندی، اپنے دین کے غلبے اور اپنے بندوں میں سے ضعیف مومنوں کو (دشمنوں کے چنگل سے) نکالنے کے لیے۔ چاہے اس میں جانوں کی ہلاکت ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمان آزادیِ عقیدہ و عمل کے بنیادی حق سے محروم ہیں اور ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور وہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے کے موقف میں بھی نہیں ہیں تو اسلامی ریاست اس سلسلے میں غیر جانب دار اور غیر متعلق ہو کر نہیں رہے گی، بلکہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے نکالنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے لیے وہ وقتِ ضرورت طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی غیر اسلامی ریاست کے ساتھ ناجنگ معاہدہ ہو تو اسلامی ریاست کے لیے لازم ہوگا کہ اس کا احترام کرے اور اس کے خلاف فوجی اقدام سے احتراز کرے۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ جن اہلِ ایمان نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور وہ دار الکفر ہی میں مقیم ہیں اگر ان پر ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اور وہ اس کے خلاف تم سے مدد طلب کر رہے ہیں تو تمھیں لازماً ان کی مدد کرنی چاہیے، لیکن اگر

---

[1] زمخشری، الکشاف، ۱/ ۵۲۳

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ج ۳، جزء ۵، ص ۱۸۰

وہ تم سے کسی ایسی قوم کے مقابلے میں مدد کے طالب ہیں، جس سے تمہارا معاہدۂ امن ہے تو ان کی حمایت میں معاہدہ کی خلاف ورزی کا تمہیں حق نہیں ہے، ورنہ یہ سنگین غلطی ہوگی اور اس پر اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔ ارشاد ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (الانفال:۷۲)

اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد طلب کریں تو تمہارے لیے مدد کرنا ضروری ہے، البتہ اس قوم کے خلاف نہیں جس کے اور تمہارے درمیان (امن کا) عہد و پیمان ہو اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو دیکھ رہا ہے۔

مفسرین نے صراحت کی ہے کہ 'دار الحرب' سے معاہدۂ امن ہو تو وہاں کے مسلمانوں کی مدد کے لیے معاہدہ ختم نہیں کیا جائے گا۔ معاہدہ اس وقت ختم ہوگا جب کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے، جیسے اسلامی ریاست کے خلاف سازش کا ارتکاب ہو یا ریاست پر وہ حملہ آور ہو۔ جب تک معاہدہ باقی ہے، اس سے جنگ نہیں ہو سکتی۔ آیت میں 'دار الحرب' سے جس میثاق کا ذکر ہے اس کے ذیل میں علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں:

فإنه لا يجوز لكم نصرهم عليهم لأنهم لا يبتدؤون بالقتال، إذ الميثاق مانع من ذلك.[۱]

دار الحرب کے مسلمان مدد طلب کریں تو تمہارے لیے دار الحرب کے خلاف مسلمانوں کی مدد جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان سے جنگ شروع کرنے میں معاہدہ مانع ہے۔

بیضاویؒ کہتے ہیں:

لا ينقض عهدهم لنصرهم عليهم.[۲]

مسلمانوں کی مدد کی خاطر ان سے جو عہد و پیمان کیا گیا ہے وہ توڑا نہیں جائے گا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

الْمَعْنَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ لَكُمْ نَصْرُهُمْ عَلَيْهِمْ إِذِ الْمِيثَاقُ مَانِعٌ مِنْ ذَلِكَ.[۳]

(آیت کے اس فقرے کے) معنیٰ یہ ہیں کہ تمہارے لیے دار الحرب کے خلاف وہاں کے مسلمانوں کی مدد جائز نہیں ہے، اس لیے کہ معاہدہ (امن) اس میں مانع ہے۔

۱۔ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/۲۳۱ ۲۔ بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/۳۹۶
۳۔ رازی، التفسیر الکبیر، جلد ۸، جزء ۱۶، ص ۱۶۷، ۱۶۸

تفسیر بغوی اور خازن میں ہے:

فلا تنصروهم عليهم[۱] (جن سے معاہدہ ہے) ان کے خلاف مسلمانوں کی مدد نہ کرو۔

موجودہ دور میں حالات بدل گئے ہیں۔اس کے باوجود اسلامی ریاست اگر کسی غیر اسلامی ریاست سے معاہدہ کرے تو اس کے شرائط میں یہ شرط بھی شامل ہونی چاہیے کہ اس کے ہاں مسلمانوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے اور ان کے ساتھ عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے۔اسی طرح اسے بین الاقوامی معاہدوں کی پابند بنانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔

---

[۱] بغوی مع الخازن: ۳/۶۹۔اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث 'اسلامی ریاست اور بین الاقوامی تعلقات' ص ۲۵۱ تا ۲۷۵

اظہارِ دین

اظہارِ دین کا وعدہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے نازل کردہ دینِ حق کے متعلق کہا گیا کہ دنیا میں لازماً اس کا 'اظہار' ہو کر رہے گا اور مخالف طاقتیں اسے ناکام نہیں کر سکیں گی۔ چناں چہ ارشاد ہے:

يُرِيدُونَ اَنْ يُّطْفِـُٔوا نُوْرَ اللهِ بِاَفْوَاهِهِمْ	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں
وَيَاْبَى اللهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ	مگر اللہ نے طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل
الْكٰفِرُوْنَ○هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	کر کے رہے گا، چاہے اسے کافر ناپسند ہی کریں۔
بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ	اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر
كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ○	بھیجا ہے، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے،
(التوبۃ: ۳۲، ۳۳)	چاہے اسے مشرک ناپسند ہی کریں۔

یہ سورۂ توبہ کی آیات ہیں۔ یہی آیات تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ صف (آیت ۸، ۹) میں آئی ہیں اور دوسری آیت جس میں 'اظہار' کا ذکر ہے سورہ فتح (آیت ۲۸) میں موجود ہے۔ سورۂ توبہ کی آیات اہل کتاب کی فتنہ سامانیوں کے ذیل میں آئی ہیں اور سورۂ صف اور سورۂ فتح میں مشرکین کی قوت آزمائی اور جنگی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ دونوں جگہ کہا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنی سازشوں اور معاندانہ کوششوں میں ناکام ہوں گے۔ وہ اللہ کے نور کو پھونک مار کر نہیں بجھا سکتے۔ وہ لازماً پھیل کر اور غالب ہو کر رہے گا۔

قرآن کے الفاظ ہیں لِیُظْھِرَہٗ تاکہ اس کا اظہار کرے۔ مفسرین میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس میں دینِ حق کے اظہار کا ذکر ہے، لیکن ان دونوں باتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اظہار چاہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہو یا آپ کے لائے ہوئے دین کا، دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہیں۔

اظہارِ دین کے معنیٰ

اب اس پر غور کیجیے کہ 'اظہار' کے معنیٰ کیا ہیں؟ بعض حضرات نے اسے صرف علمی و فکری اظہار اور بعض نے اسے خالص سیاسی نوعیت کا اظہار تصور کیا ہے۔ ان دونوں میں پوری صداقت نہیں، جزوی صداقت ہے۔ اس لیے کہ ان میں 'اظہار' کا صرف ایک پہلو بیان ہوا ہے اور دوسرا نظر انداز ہو گیا ہے۔ لغت میں اس کے دونوں معنیٰ بیان ہوئے ہیں۔ چناں چہ لسان العرب میں اس مادّے کے استعمالات کا ذکر اس طرح ہے:

وظَهَرَ عَلَى الشَّيْءِ إذا غَلَبَهُ وَعَلَاهُ. وَيُقَالُ: ظَهَرَ فلانٌ الجَبَلَ إذا عَلَاهُ. ..... يُقَالُ: أَظْهَر اللَّهُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ أَي أَعلاهم عَلَيْهِمْ....وأَظْهَرْتُ الشَّيْءَ: بَيَّنْته... يُقَالُ: أَظْهَرَنِي اللَّهُ عَلَى مَا سُرِقَ مِنِّي أَي أَطلعني عَلَيْهِ.[1]

ظھر علی الشیء کے معنیٰ ہیں اس چیز پر غالب آ گیا اور چڑھ گیا۔ ظھر فلان الجبل اس وقت کہا جائے گا جب کہ آدمی پہاڑ پر چڑھ جائے۔ أظھر اللہ المسلمین علی الکافرین اس وقت کہا جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ کافروں پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کر دے۔ اسی طرح أظھرت الشیء کے معنیٰ ہیں میں نے وہ چیز بیان کر دی۔ کہا جاتا ہے أظھرنی اللہ علی ما سرق منی یعنی میری جو چیز چوری ہوئی تھی اللہ نے مجھے اس کی اطلاع دے دی۔

علمی اور سیاسی غلبہ

اس میں غلبے اور سربلندی کا تصور بھی ہے اور ظہور اور وضاحت کے معنیٰ بھی ہیں۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب: ۵۲۶/۴، ۵۲۷، مادہ ظہر

علامہ بغویؒ کہتے ہیں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آیت میں لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ اس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین کے تمام احکام وقوانین کی اس طرح تعلیم دے گا کہ اس کا کوئی پہلو مخفی یا غیر واضح نہ رہے۔ مزید فرماتے ہیں: بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس میں ضمیر دینِ حق کی طرف راجع ہے۔ اس کے تمام ادیان پر اظہار کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت صرف اسی (کی تعلیمات) کے مطابق ہو۔[1]

امام شافعیؒ نے اسے وضاحت ہی کے معنی میں لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اپنے دین کا اظہار کر دیا۔ یعنی اس کی اس طرح وضاحت فرما دی کہ جس نے بھی اسے سنا اس پر واضح ہو گیا کہ وہ حق ہے اور اس دین کے خلاف جو ادیان ہیں وہ باطل ہیں۔[2]

علامہ ابو بکر جصاص حنفیؒ نے اس آیت کی تشریح میں ان دونوں پہلوؤں کو شامل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ ان کی مدد ہو گی اور ان کا دین تمام ادیان پر غالب ہو گا۔ اظہار سے مراد ہے دلیل (کے ذریعے سے) اور غلبہ و اقتدار کے ذریعے سے غالب ہونا اور آپ کی امت کا ان تمام قوموں کو زیر کر دینا جو دین اسلام کی مخالف تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے وہ چیز دیکھ لی جس کی خبر آپ کو دی گئی تھی کہ آپ کی امت کو اسلام مخالف تمام قوموں پر غلبہ حاصل ہو گیا۔[3]

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اظہار سے مراد دلائل کے ذریعے سے غالب ہونا نہیں، بلکہ سیاسی غلبہ ہی مراد ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اللہ کا دین دلائل کے ذریعے سے ہمیشہ ہی غالب

---

[1] بغوی مع الخازن تفسیر: ۳/۱۰۹

[2] البحر المحیط: ۵/۳۴

[3] احکام القرآن: ۳/۱۳۵

رہا ہے اور آیت میں مستقبل میں اس کے غالب ہونے کی خبر دی گئی ہے اور یہ سیاسی غلبہ ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ رشید رضا مصریؒ ان دونوں معانی کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَالِاسْتِعْلَاءُ هُنَا بِالْعِلْمِ وَالْحُجَّةِ، أَوِ السِّيَادَةِ وَالْغَلَبَةِ، أَوِ الشَّرَفِ وَالْمَنْزِلَةِ، أَوْ بِهَا كُلِّهَا، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، وَإِنْ كَانَ الْوَعْدُ يَصْدُقُ بِبَعْضِهَا[۲]

یہاں غلبہ اور بلندی سے مراد علم اور دلیل کا یا سرداری اور اقتدار کا یا شرف وعزت اور مرتبہ کا غلبہ ہے، یا یہ کہا جائے کہ اس میں یہ تمام پہلو شامل ہیں۔ یہی رائے پسندیدہ اور قابل ترجیح ہے، گو کہ وعدہ ان میں سے بعض کی تصدیق کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی نظریہ کی علمی اور فکری برتری یا اس کا اقتدار پر پہنچنا اور اسے عزت ووقار اور اعتبار کا حاصل ہونا، یہ سب غلبہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں ایک طرح کا ربط و تعلق بھی ہے۔[۳]

اظہارِ دین کس طرح ہوا؟

اب اس بات پر غور کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے لائے ہوئے دین حق کا اظہار یا غلبہ کس طرح ہوا اور وہ کس طرح عالم وجود میں آیا؟

ایک رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق جزیرۃ العرب سے ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں یہ وعدہ پورا ہو گیا۔[۴]

---

[۱] التفسیر الکبیر: ج ۸، جزء ۱۶، ص ۳۳

[۲] تفسیر المنار: ۱۰/ ۳۸۹-۳۹۰

[۳] راقم نے اس موضوع پر ایک مضمون میں مختصر سی گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعہ مضامین 'دور حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے' مضمون 'احیاء اسلام کے علمی تقاضے بعض قرآنی اصطلاحات کی روشنی میں'۔

[۴] علامہ قرطبی کہتے ہیں: قیل اراد لنظہرہ علی الدین کلہ فی جزیرۃ العرب وقد فعل (قرطبی، تفسیر جلد ۴، جزء ۸، ص ۸۷) قرطبی نے اس کے علاوہ کسی دوسری رائے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی امت کو متمدن دنیا کے بڑے حصہ پر غلبہ عطا فرمایا۔ اسی کا یہاں ذکر ہے۔[1] اس رائے کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا، وَأُعْطِيتُ الْكَنْزَيْنِ الْأَحْمَرَ وَالْأَبْيَضَ[2]

(اللہ تعالیٰ نے زمین کو جمع کر کے میرے سامنے کر دیا۔ میں نے اس کے مشرق و مغرب کے تمام حصوں کو دیکھا۔ میری امت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک مجھے زمین جمع کر کے دکھائی گئی ہے۔ مجھے سونے اور چاندی کے خزانے دیے گئے)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ بعد میں پورا ہوا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج الٹ دیے گئے اور وہاں کی حکومتیں اسلامی اقتدار کے زیر نگیں آ گئیں۔ ان کے خزانے جنہیں حکمراں اپنے عیش و عشرت پہ لٹا رہے تھے عام انسانوں کی خدمت اور فلاح پر صرف ہونے لگے جسے احادیث میں فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

دورِ آخر میں اظہارِ دین کی بشارت

دورِ آخر میں اظہارِ دین کی بشارت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا ختم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کے ماننے والوں کا اس طرح غلبہ ہوگا کہ تمام ادیان اس کے ماتحت ہو کر رہ جائیں گے۔ اس میں نوعِ انسانی کو اسی طرح عدل و انصاف اور امن و امان حاصل ہوگا، جس طرح دورِ اول میں ہوا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اب اس اظہار کی کیا شکل ہوگی؟ کیا یہ کام دلائل اور

---

[1] اظہارِ دین سے متعلق مفسرین کی آرا کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابوحیان اندلسی ۵/ ۳۴۔ تفسیر الخازن مع تفسیر البغوی ۳/ ۱۰۹

[2] مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ: باب ھلاک ھذہ الامۃ بعضھم ببعض

براہین کے ذریعے ہوگا، یا بزورِقوتِ تمام ادیان کو زیر کرنے اور ان پر غالب آنے کی کوشش ہوگی؟ اس کے جواب کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آپ کا اسوہ بتاتا ہے کہ آپ نے پہلے یہ ثابت کیا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ اس کے حق ہونے پر مضبوط دلائل موجود ہیں۔ ان کی تردید کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اس کے مخالفین بے دلیل اس سے لڑ رہے ہیں۔ آپ نے جنگ اس وقت کی جب کہ مخالفین کے پاس فوجی اور عسکری اور سیاسی قوت تو تھی، لیکن دلیل کی قوت سے وہ تہی دامن تھے۔ اس طرح دلیل کے میدان میں برتری حاصل ہونے کے بعد آپ کو سیاسی میدان میں غلبہ حاصل ہوا تھا۔ یہی راستہ آج بھی ہے۔ اس کے بغیر یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔

جہاد کے احکام

جہاد فرضِ کفایہ ہے

بعض اوقات جہاد کا اس طرح ذکر ہوتا ہے جیسے یہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور جو اس میں کوتاہی کرے گا وہ گناہ گار ہوگا۔ کفار اور مخالفین سے جنگ پوری امت کا نصب العین ہے اور اسلام اسی کے لیے اس کے ایک ایک فرد کو تیار کرتا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی ہے۔ اسلام نے دین کی حفاظت اور سربلندی کے لیے جہاد کی ترغیب ضرور دی ہے اور اس کا بے پایاں اجر وثواب بھی بیان کیا ہے، لیکن اسے ہر ایک پر فرض نہیں قرار دیا ہے۔ قرآن نے صراحت کی ہے۔

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء: ۹۵، ۹۶)

اہلِ ایمان میں سے وہ جو معذور نہیں ہیں پھر بھی بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ وہ لوگ جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والے ہیں، اللہ نے انہیں بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت عطا کی ہے۔ اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر اجرِ عظیم کی فضیلت دی ہے، جو اس کی طرف سے درجات اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فقہی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ جہاد فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے۔

اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دفاع کا نظم کرے اور جو قوتیں برسرِ پیکار ہیں ان کے مقابلہ کے لیے جتنی افرادی قوت کی ضرورت ہے وہ فراہم کرے۔ جہاد میں وہی لوگ شریک ہوں گے جنہیں اسلامی ریاست اس کے لیے تیار کرے گی اور جو اس کی فوج میں شامل ہوں گے۔ ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت کے بیان میں 'درجہ' اور 'درجات' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کی توجیہ علامہ زمخشریؒ نے یہ کی ہے کہ جو لوگ جہاد میں شرکت سے معذور ہیں ان کے مقابلہ میں مجاہدین کو ایک درجہ فضیلت ہے اور جو غیر معذور جنگ میں شریک نہیں ہیں ان پر مجاہدین کو کئی درجہ فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ زمخشریؒ کے الفاظ ہیں:

وأما المفضلون درجات فالذين فضلوا على القاعدين الذين أذن لهم في التخلف اكتفاء بغيرهم، لأن الغزو فرض كفاية.[1]

جن لوگوں کو کئی درجہ فضیلت حاصل ہے، یہ ان لوگوں کے مقابلے میں ہے جن کو جہاد میں عدمِ شرکت کی اس وجہ سے اجازت دے دی گئی کہ اس کے لیے دوسرے لوگ کافی تھے، اس لیے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے (سب پر فرض نہیں ہے)۔

آیت کے الفاظ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے) سے استدلال کرتے ہوئے علامہ ابن کثیرؒ کہتے ہیں:

وَفِيهِ دِلَالَةٌ عَلَى أَنَّ الْجِهَادَ لَيْسَ بِفَرْضِ عَيْنٍ بَلْ هُوَ فَرْضٌ عَلَى الْكِفَايَةِ.[2]

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہے، بلکہ یہ فرض علی الکفایہ ہے۔

فقہ حنبلی میں کہا گیا ہے:

الجهاد فرض على الكفاية إذا قام به فريق من الناس سقط عن الباقين.

جہاد فرض علی الکفایہ ہے۔ جب کچھ لوگ اسے انجام دیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۴۲، ۵۴۳

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۵۴۱

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

معنى فَرْضِ الكِفايةِ، الذي إن لم يَقُم به مَنْ يَكْفِي، أَثِمَ النَّاسُ كلُّهم، وإن قامَ به مَنْ يَكْفِي، سَقَطَ عن سائرِ النَّاسِ. فالخِطَابُ في ابتِدائِه يتَناولُ الجميعَ[1]

فرض کفایہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر اتنے افراد اس پر عمل نہ کریں جو اس کے لیے کافی ہوں تو سب ہی لوگ اس کوتاہی کے لیے گناہ گار ہوں گے اور اگر اس پر اتنے لوگ عمل کریں جو اس کے لیے کافی ہوں تو یہ سب سے ساقط ہوجائے گا۔ اس لحاظ سے خطاب ابتدا میں تمام ہی لوگوں کو شامل ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں جہاد کی قانونی حیثیت اور اس کی علت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وهو (الجهاد) فرض على الكفاية لأنه ما فرض لعينه إذ هو إفساد في نفسه وإنما فرض لإعزاز دين الله ودفع الشر عن العباد فإذا حصل المقصود بالبعض سقط عن الباقين كصلاة الجنازة ورد السلام[2]

جہاد فرض کفایہ ہے۔ وہ اس لیے فرض نہیں کیا گیا ہے کہ بذاتہٖ مقصود ہے، اس لیے کہ وہ فی نفسہٖ خوں ریزی ہے۔ جہاد درحقیقت اللہ کے دین کی سربلندی اور بندوں سے دفع شر کی خاطر فرض کیا گیا ہے۔ جب یہ مقصود بعض افراد کے ذریعے حاصل ہوجائے تو باقی سے ساقط ہوجائے گا۔ جیسے نمازِ جنازہ اور سلام کے جواب کا معاملہ ہے۔

علامہ کاسانیؒ نے بھی جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی یہی توجیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] ابن قدامہ: ۶/۱۳

[2] ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/۴۲۱، ۴۲۲

ولأن ما فرض له الجهاد وهو الدعوة إلى الإسلام، وإعلاء الدين الحق، ودفع شر الكفرة وقهرهم، يحصل بقيام البعض به.[۱]

جس مقصد سے جہاد فرض کیا گیا ہے وہ ہے (پہلے) اسلام کی دعوت دینا، دین حق کو سربلند کرنا اور منکرین کے شر، ان کے قہر اور غلبے کو دفع کرنا۔ یہ مقصد بعض لوگوں کے کھڑے ہو جانے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اس سے جہاد کا مقصد واضح ہے۔ وہ ہے (جہاد سے پہلے) اسلام کی دعوت، دین حق کی سربلندی، مخالفین اور معاندین کے شر اور ان کے غلبہ اور قہر کو دفع کرنا۔ یہ مقصد جب بعض افراد کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے تو اس کے لیے ریاست کے تمام مسلمانوں کا میدانِ جنگ میں کود پڑنا ضروری نہیں ہے۔ اسی پہلو سے جہاد کو فرض کفایہ کہا گیا ہے۔

جہاد کے فرضِ عین نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ اگر ہر فرد اس میں لگ جائے تو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت اور حصولِ معاش جیسی انسانی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں (جس سے کوئی بھی ملک غفلت نہیں برت سکتا) اور خود جہاد بھی نہیں کیا جا سکے گا۔[۲]

جہاد کب فرضِ عین ہوتا ہے؟

بعض ایسے حالات اور مواقع بھی آتے ہیں جب کہ آدمی کے لیے جہاد اختیاری عمل نہیں رہتا، بلکہ فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ علماء نے ان کی بھی تعیین کی ہے۔ جہاد کے بارے میں اسلام کا موقف سمجھنے کے لیے ان سے واقفیت ضروری ہے۔

---

[۱] کاسانی، بدائع الصنائع: ۷/ ۱۴۵، ۱۴۶

[۲] مرغینانی، ہدایہ۔ علامہ ابن الہمامؒ کہتے ہیں کہ جہاد کو فرضِ عین قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب کے سب ایک ساتھ جہاد کے لیے نکل پڑیں۔ باری باری یہ فرض ادا ہو سکتا ہے۔ اس میں مذکورہ نقصان نہیں ہے۔ اصل دلیل سورۂ نساء کی آیت ۹۵ ہے، جو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/ ۴۲۲-۴۲۳

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

جہاد فرضِ کفایہ ہے، لیکن یہ تین صورتوں میں فرضِ عین ہو جاتا ہے: ایک یہ کہ محاذِ جنگ پر دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں۔ اس صورت میں اسلامی فوج کے ہر سپاہی کے لیے جہاد فرض ہو جائے گا اور اس وقت کسی بھی فرد کے لیے جنگ سے فرار جائز نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مسلم آبادی پر دشمن کا غلبہ ہو جائے (یعنی اسلامی ریاست کے کسی شہر پر مخالف طاقت کا قبضہ ہو جائے) اس صورت میں وہاں کے باشندوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کا مقابلہ کرنا اور اسے اپنے علاقہ سے نکال باہر کرنا فرض ہو جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ امام کی طرف سے نفیر عام (عام لام بندی کا حکم) ہو۔ اس وقت جس علاقے سے اس کا خطاب ہوگا اس میں جو فرد بھی جنگ کے قابل ہوگا اسے امام کی آواز پر حاضر ہونا ضروری ہوگا۔[1]

یہ وہ صورتیں ہیں جن میں دنیا کی ہر ریاست اپنے شہریوں پر جنگ میں شرکت اور دشمن کے مقابلے کو لازم قرار دیتی ہے۔ کسی فوجی کا محاذِ جنگ سے فرار اختیار کرنا ہمیشہ سے ایک سنگین جرم رہا ہے۔ ریاست کے کسی حصہ پر دشمن کا قبضہ ہو اور وہاں کے باشندے خاموشی سے اس قبضے کو برداشت کر لیں اور اس کی مدافعت نہ کریں تو اسے ریاست سے عدمِ وفاداری کے ہم معنیٰ سمجھا جائے گا اور اس کے خلاف سخت کارروائی ہوگی۔ اسی طرح ریاست کسی وقت ان افراد اور جوانوں کو جو جنگ کے قابل ہیں، محاذِ جنگ پر بھیجنا چاہے تو اس کی آواز پر لبیک کہنا لازم ہے۔ اس سے بچنے کی ہر کوشش قابلِ مذمت اور قابلِ تعزیر خیال کی جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، البتہ بعض حالات میں یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ ان حالات کا تعلق ریاست کی ضروریات اور اس کی بقا اور سلامتی سے ہے۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۸

فرضِ عین فرضِ کفایہ پر مقدم ہے

یہ ایک اصولی بات ہے کہ کسی فرضِ عین کو پس پشت ڈال کر فرضِ کفایہ پر عمل نہیں ہوگا۔ اسے جہاد ہی سے متعلق ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جہاد کے لیے والدین کی اجازت

والدین اگر خدمت کے حاجت مند ہوں تو انہیں نظر انداز کر کے جہاد میں شرکت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور والدین خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت فرضِ عین ہے۔ احادیث میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے والدین حیات ہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں! آپ نے فرمایا:

ففيهما فجاهد[1] تو تم ان کے سلسلہ میں جہاد کرو۔

مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت اور توانائی ان کی خدمت میں لگاؤ۔ مسلم کی ایک روایت میں اس کی مزید تفصیل ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد کے لیے آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میرے پیشِ نظر اجر و ثواب ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے کہا: دونوں ہی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ سے اجر و ثواب چاہتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا:

---

[1] بخاری: کتاب الجہاد، باب الجہاد باذن الابوین۔ مسلم: کتاب البر والصلۃ، باب بر الوالدین وانہما احق بہ

فَارْجِعْ إِلَى وَالِدَيْكَ فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا[1]	اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں۔

وَفِي الْحَدِيثِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ بِرَّ الْوَالِدَيْنِ قَدْ يَكُونُ أَفْضَلَ مِنَ الْجِهَادِ.[2]	حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کبھی جہاد سے افضل ہو جاتا ہے۔

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں، لیکن اس طرح آیا ہوں کہ میرے ماں باپ میری جدائی سے رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

ارْجِعْ إِلَيْهِمَا فَأَضْحِكْهُمَا كَمَا أَبْكَيْتَهُمَا[3]	ان کے پاس واپس جاؤ۔ انہیں اس طرح ہنساؤ (خوش کرو) جس طرح تم نے انہیں رُلایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص یمن سے سفر کر کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور جہاد میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا یمن میں تمہارا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں! ماں باپ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا انھوں نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے؟ اس نے کہا، اجازت نہیں دی ہے۔ آپ نے فرمایا:

ارْجِعْ إِلَيْهِمَا فَاسْتَأْذِنْهُمَا، فَإِنْ أَذِنَا لَكَ فَجَاهِدْ، وَإِلَّا فَبِرَّهُمَا[4]	واپس ان کے پاس جاؤ، ان سے اجازت طلب کرو۔ اگر وہ اجازت دیں تو جہاد کرو۔ ورنہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب بر الوالدین وانھما احق بہ

[2] شوکانی: نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۰

[3] ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب الرجل یغزو وابواہ کارہان

[4] ابوداؤد، حوالہ سابق۔ ابن ماجہ میں یہ روایت زیادہ تفصیل سے آئی ہے۔ کتاب الجہاد، باب الرجل یغزو ولہ ابوان

جاھمۃ السّلمی کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میرا ارادہ غزوے میں شرکت کا ہے۔ آپ سے مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا تمھاری ماں حیات ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

فَالْزَمْهَا، فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا [1]

اسے پکڑے رہو، اس لیے کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

یہ احادیث اس امر کی دلیل ہیں کہ جہاد پر جانے کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ اس کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ والدین کی خدمت فرضِ عین ہو جائے اور جہاد کی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہو تو والدین کی خدمت کو مقدم رکھا جائے گا۔ انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر جہاد کے لیے جانا درست نہ ہوگا، لیکن اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے اور محاذِ جنگ پر جانا لازم قرار پائے تو والدین کے منع کرنے یا ان کی مجبوری کے باوجود آدمی جہاد پر جائے گا۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس مسئلہ میں فقہاء کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَعَامَّةُ الْفُقَهَاءِ مُتَّفِقُونَ عَلَى أَنَّ مِنْ شَرْطِ هَذِهِ الْفَرِيضَةِ إِذْنُ الأَبَوَيْنِ فِيهَا، إِلَّا أَنْ تَكُونَ عَلَيْهِ فَرْضَ عَيْنٍ مِثْلَ أَنْ لَا يَكُونَ هُنَالِكَ مَنْ يَقُومُ بِالْفَرْضِ إِلَّا بِقِيَامِ الْجَمِيعِ بِهِ. [2]

عام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ فریضۂ جہاد کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کے لیے والدین کی اجازت حاصل ہو، الّا یہ کہ وہ فرضِ عین ہو جائے، مثال کے طور پر کسی جگہ اس فرض کے ادا کرنے کی یہی صورت ہو کہ سب لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

علامہ شوکانیؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فان اذنا فجاهد (اگر ماں باپ اجازت دیں تو تم جہاد کرو) یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جہاد میں شرکت کے

---

[1] نسائی: کتاب الجہاد، باب الرخصۃ فی التخلف لمن لہ والدۃ۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب الرجل یغزو ولہ ابوان۔ مسند احمد جلد ۴، ص ۴۴۷، حدیث نمبر ۱۵۱۱۰

[2] ابن رشد: بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد: ۴۰۹/۳

لیے والدین کی اجازت کا ہونا واجب ہے۔ یہی جمہور کی رائے ہے۔ انھوں نے قطعیت سے کہا ہے کہ ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک جہاد پر جانے سے منع کرے تو اولاد کے لیے جہاد پر جانا حرام ہے، اس لیے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ۔ ہاں اگر جہاد فرض عین ہو جائے تو ان کی اجازت ضروری نہ ہوگی۔

مزید فرماتے ہیں: ابن حبان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے لیے والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ اسے اس صورتِ حال پر محمول کرنا ہوگا جب کہ جہاد فرضِ عین قرار پائے۔ اس سے دونوں طرح کی روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔[1]

غیر مسلم والدین کا حکم

ایک سوال یہ بھی فقہاء کے درمیان زیر بحث رہا ہے کہ کیا غیر مسلم والدین کا بھی وہی حکم ہے جو مسلم والدین کا ہے؟ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کے لیے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ جہاد کے لیے نکلتے تھے اور مخالفین کی صف میں ان کے کافر ماں باپ ہوتے تھے۔ ان سے اجازت لے کر وہ شریکِ جہاد نہیں ہوتے تھے۔ لیکن امام ثوریؒ کہتے ہیں کہ ماں باپ کافر ہوں تو بھی ان کی اجازت ہی سے آدمی جہاد پر جائے گا۔[2]

فقہ مالکی میں کہا گیا ہے کہ والدین کو اس بات کا حق ہے کہ فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لیے سفر پر جانے سے اولاد کو روک دے، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ جہاد کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ جہاد پر جانے سے اولاد کو روکنے کا کافر والدین کو حق نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اسلام کی توہین و

---

[1] شوکانی: نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۰

[2] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۶

تذلیل کے جذبے سے اسے روک رہے ہوں، لیکن اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ شفقت و محبت کی بنا پر اسے منع کر رہے ہیں تو ان کی بات مانی جائے گی۔[۱]

علامہ ابن عابدین حنفیؒ کہتے ہیں: ''ماں باپ کو اور ان میں سے کسی بھی ایک کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اولاد کو جہاد پر جانے سے روک دے۔ اس سے وہ گناہ گار نہیں ہوں گے۔ اگر ماں باپ کو اولاد کے سفر پر جانے سے شدید تکلیف ہو رہی ہے یا بے توجہی سے ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے تو وہ منع کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں فقہ حنفی میں کافر اور مسلمان والدین میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ کافر ماں باپ کفر کی محبت میں جہاد سے روک رہے ہوں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔[۲]

بعض مزید وضاحتیں

جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت کے ذیل میں فقہاء نے بعض اور باتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ انہیں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱- جہاد میں جان کا خطرہ ہے۔ اس میں ایک طرف تو والدین کی ضروریات اور ان کے حقوق کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور دوسری طرف ان کے جذبات کی بھی رعایت ہے۔ اس وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کوئی ایسا سفر کرنا چاہے جس میں اس کی جان کو بظاہر کوئی خطرہ نہ لاحق ہو تو اس کے لیے والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ یہ والدین کی نافرمانی نہیں سمجھی جائے گی۔ علامہ کاسانیؒ کہتے ہیں:

وَالأَصْلُ أَنَّ كُلَّ سَفَرٍ لَا يُؤْمَنُ فِيهِ الْهَلَاكُ، وَيَشْتَدُّ فِيهِ الْخَطَرُ لَا يَحِلُّ لِلْوَلَدِ أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْهِ بِغَيْرِ إِذْنِ وَالِدَيْهِ؛ لِأَنَّهُمَا يُشْفِقَانِ عَلَى وَلَدِهِمَا فَيَتَضَرَّرَانِ بِذَلِكَ، وَكُلُّ سَفَرٍ لَا يَشْتَدُّ فِيهِ الْخَطَرُ	اس میں اصل یہ ہے کہ ہر وہ سفر جس میں آدمی ہلاکت سے محفوظ نہ ہو اور شدید خطرہ ہو تو اولاد کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر اس طرح کے سفر پر جائے، کیوں کہ وہ ان پر مہربان ہوتے ہیں اور اس طرح کے سفر سے ان کو صدمہ پہنچے گا، اس کے

[۱] صاوی علی الشرح الصغیر: ۲/ ۲۷۴

[۲] ابن عابدین، ردالمحتار علی الدرالمختار: ۶/ ۲۰۲

يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِمَا إِذَا لَمْ يُضَيِّعْهُمَا؛ لِانْعِدَامِ الضَّرَرِ، وَمِنْ مَشَايِخِنَا مَنْ رَخَّصَ فِي سَفَرِ التَّعَلُّمِ بِغَيْرِ إِذْنِهِمَا؛ لِأَنَّهُمَا لَا يَتَضَرَّرَانِ بِذَلِكَ بَلْ يَنْتَفِعَانِ بِهِ، فَلَا يَلْحَقُهُ سِمَةُ الْعُقُوقِ.[1]

برخلاف کوئی بھی ایسا سفر جس میں شدید خطرہ نہ ہو تو اولاد کے لیے جائز ہے کہ والدین کی اذن کے بغیر سفر کرے۔ اس لیے کہ اس سے ان کو کوئی ضرر نہیں لاحق ہوگا، بلکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس صورت میں اولاد پر والدین کی نافرمانی کا الزام نہیں آئے گا۔

اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر اولاد تجارت، حج اور عمرہ یا تعلیم کی خاطر سفر کر سکتی ہے۔[2]

۲- جہاد کے معاملے میں والدین اور اولاد کا جو حکم ہے وہی حکم بیوی اور شوہر کا بھی ہے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت جہاد پر نہیں جا سکتی۔ اس لیے کہ شوہر کے حقوق اس کے لیے فرضِ عین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں اگر جہاد اس پر فرض ہو جائے تو وہ اس کی اجازت کے بغیر بھی اس میں شریک ہوگی۔ اس سلسلے میں فقہاء نے آقا اور غلام کی مثال بھی دی ہے۔ غلام اپنے مالک کی اجازت ہی سے جہاد کے لیے جا سکتا ہے۔ (غلامی کا وجود اس وقت عملاً نہیں ہے، لیکن اس سے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے)۔[3]

۳- والدین کے احترام اور ان سے اجازت کی خاص اہمیت ہے، لیکن شرعی فرائض کی ادائیگی میں انسان ان کی اجازت کا پابند نہیں ہے۔ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

''جہاد فرض قرار پائے تو والدین کی عدمِ اجازت کا اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ فرض کا ترک کرنا معصیت ہے۔ یہی حکم حج، باجماعت نماز، جمعہ میں شرکت اور دین کی بنیادی تعلیم کے حصول کے لیے سفر کا ہے۔ یہ والدین کی اجازت پر منحصر نہیں ہیں۔ امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ فرائض کی ادائیگی، جمعہ، حج اور جہاد (جب وہ فرض ہو جائے) سے

---

[1] کاسانی، بدائع الصنائع: ۷/۱۴۶

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۶/۲۰۲

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۶/ ۲۰۳-۲۰۵۔ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۷، ۲۷، ۲۸۔ حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۲/ ۲۷۴

والدین منع کریں تو ان کی اطاعت نہ ہوگی کیوں کہ یہ سب فرائض ہیں۔ ان کا حکم نماز کا ہے۔''[1]

حقوق العباد کی اہمیت

جہاد کے سلسلے میں والدین کے حقوق کی طرح دیگر انسانوں کے حقوق کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ کسی فرد کو جہاد پر نکلنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے ذمے کسی کا حق تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے اس کی فکر کرنی ہوگی۔ اسے نظر انداز کر کے جہاد کے لیے نکل پڑنا صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے ہدایت کی ہے کہ جہاد میں شرکت سے کسی کا حق ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس کا قوی اندیشہ ہو تو جہاد میں شرکت درست نہیں ہے۔

شہادت سے قرض معاف نہیں ہوتا

اس کی ایک نمایاں مثال قرض ہے۔ صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ کے راستے میں خلوص کے ساتھ جان دی ہے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، لیکن قرض اس کے ذمہ ہے تو معاف نہ ہوگا۔ حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھڑے ہوئے اور (خطبہ) ارشاد فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ تمام اعمال میں افضل ہیں۔ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میں اللہ کے راستے میں جان دے دوں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا:

نَعَمْ، إِنْ قُتِلْتَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ

ہاں! اگر تم اللہ کے راستے میں اس طرح مارے گئے کہ میدان میں پامردی کے ساتھ جمے رہے، اللہ سے اجر و ثواب کی توقع رکھی، تمہاری پیش قدمی جاری رہی، اور تم نے پیٹھ نہ دکھائی (تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام قصور معاف کر دے گا)۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۶، ۲۷

تھوڑی دیر بعد آپ نے اس سے کہا کہ اپنا سوال پھر سے دہراؤ۔ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔ آپ نے وہی جواب دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

إِلَّا الدَّيْنَ، فَإِنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِي ذَلِكَ[1]

لیکن تمہارے ذمہ کسی کا قرض ہے تو وہ معاف نہیں ہوگا۔ جبریل نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ[2]

شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے سوائے قرض کے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت انسؓ سے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خَطِيئَةٍ، فَقَالَ جِبْرِيلُ: إِلَّا الدَّيْنَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِلَّا الدَّيْنَ[3]

اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دینا (وہ عمل ہے جو) ہر گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ اس پر حضرت جبریل نے کہا: سوائے قرض کے، رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا: سوائے قرض کے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاد میں پورے خلوص اور استقامت کے ساتھ شرکت ہو اور اس کے تقاضے پورے کیے جائیں، تو سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوگا۔ اگر وہ ادا نہ ہوا تو اس کی ضرور باز پرس ہوگی۔

علامہ شوکانیؒ اس موضوع سے متعلق احادیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ

---

[1] مسلم: کتاب الامارۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین۔ بعض روایات میں تفصیلات میں کسی قدر فرق ہے۔ ملاحظہ ہو نسائی: کتاب الجہاد، باب من قتل فی سبیل اللہ وعلیہ دین۔

[2] مسلم: حوالہ سابق

[3] ترمذی: کتاب فضل الجہاد، باب ماجاء فی ثواب الشہداء

احادیث اس امر کی دلیل ہیں کہ جہاد سے تمام گناہ اور قصور معاف ہو جاتے ہیں، بشرطے کہ وہ اللہ کے راستے میں ہو، اس سے اجر و ثواب کی طلب پیش نظر رہے اور آدمی محاذِ جنگ پر پسپائی نہ اختیار کرے۔ شہید مغفرتِ عامہ کا مستحق ہوتا ہے، البتہ اس سے 'دیونِ لازمہ' (یعنی ایسے قرض جن کی ادائیگی لازم ہے) معاف نہیں ہوں گے۔ یہ شہادت کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ ان کا تعلق انسانوں کے حقوق سے ہے۔ یہ اسی وقت ساقط ہوں گے، جب کہ متعلقہ شخص اپنی مرضی، خوشی اور اختیار سے انہیں ساقط کر دے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جس پر قرض تھا۔[1]

سوال یہ ہے کہ اگر قرض دار جہاد میں شریک ہونا چاہے تو اسے کیا کرنا ہوگا؟ اس کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ اگر اس نے ادائے قرض کا نظم کر دیا ہو، یا کوئی اس کی طرف سے ادائیگی کی ضمانت لے لے تو وہ جہاد پر جا سکتا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ دائن (قرض دینے والا) کی اجازت سے وہ جہاد پر جا سکتا ہے، اگر وہ اجازت نہ دے تو نہ جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرض فوری طور پر واجب الادا ہو تو دائن کی اجازت ہونی چاہیے، ورنہ اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی قانونی حیثیت بیان کرتے ہوئے قاضی شوکانیؒ کہتے ہیں:

"اس سلسلے کی احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شہید کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے، سوائے قرض کے، اگر وہ ادا ہونے سے رہ جائے۔ اس سے یہ استدلال صحیح نہ ہوگا کہ جب تک دائن کی اجازت نہ ہو، آدمی جہاد پر نہیں جا سکتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ اگر آدمی یہ چاہے کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں تو اسے دائن سے اجازت لینی چاہیے۔ اگر وہ سوچے کہ اس گناہ کی عدم مغفرت کے باوجود عمومی ثواب کی خاطر اسے جہاد پر جانا چاہیے تو وہ جا سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے جائز ہوگا۔ یہ اس صورت

---

[1] نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۱، ۲۵۲

میں ہے جب کہ اسے قرض فوری طور پر ادا کرنا ہو، لیکن اگر اس میں تاخیر کی گنجائش ہو تو اس میں دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ اس صورت میں بھی دائن (قرض دینے والا) سے اجازت لینی چاہیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اسے دائن سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت سفرِ تجارت کی سی ہے۔ (جب وہ تجارت کے لیے سفر کر سکتا ہے تو جہاد پر بھی جا سکتا ہے)۔[1]

حدیث میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے قرض لے رکھا ہے، اسے اس نے ادا نہیں کیا، یا اس کا ارادہ اسے ادا کرنے کا نہیں ہے تو راہِ خدا میں جان دینے کے باوجود وہ معاف نہیں ہوگا اور اللہ کے ہاں اس کی جواب دہی اسے کرنی ہوگی۔ اس پر قرض دار کا یہ سوچنا حدیث کی روح کے منافی ہے کہ وہ قرض کی فکر کیے بغیر مغفرت عامہ کی توقع پر جہاد میں شریک ہوگا اور جان دے گا۔

علامہ ابن رشدؒ کہتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ جہاد میں شرکت کے لیے قرض خواہ کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں؟ جمہور نے اجازت کے بغیر شرکت کو جائز قرار دیا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ ادائے قرض کے لیے کوئی چیز چھوڑ جائے۔[2]

لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اس میں فقہاء کے نقطۂ نظر کی ٹھیک سے ترجمانی نہیں ہوسکی ہے۔ قرض دینے والے اور قرض دار کے سلسلے میں فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذیل میں کسی قدر اختصار سے اسے پیش کیا جا رہا ہے:

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں کہ جس شخص پر قرض ہو، چاہے وہ فوری طور پر واجب الادا نہ ہو، بلکہ اس میں تاخیر ہوسکتی ہو تو اس کے لیے دائن (قرض دینے والے) کی

---

[1] نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۲

[2] ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ۳/ ۴۱۰

اجازت کے بغیر جہاد پر جانا جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ وہ اس کی ادائیگی کا انتظام کر جائے یا اس کے لیے کوئی کفیل مقرر کر دے، یا اس کے لیے کوئی چیز رہن رکھ دے۔ یہی امام شافعیؒ کی رائے ہے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس شخص کو جنگ میں شرکت کی اجازت دی ہے جو اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ اس لیے کہ غیر مستطیع شخص سے فوری طور پر قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں ہوتا اور نہ اس وجہ سے اسے قید کیا جائے گا، اس لیے قرض نہ ادا کرنے پر جنگ سے اسے روکنا صحیح نہیں ہے۔ گویا اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے، جس کے اوپر کوئی قرض نہیں ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جہاد اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی جان دے اور شہادت حاصل کرے، لیکن یہاں اس سے ایک حق ضائع ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے احادیث میں آتا ہے کہ جہاد سے قرض کے علاوہ اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ہاں اگر جہاد فرض ہو جائے تو اس کا حکم دوسرا ہے۔ لہٰذا اگر وہ ادائے قرض کے لیے کوئی چیز چھوڑ جائے، یا اس کے لیے کوئی کفیل مقرر کر دے تو وہ بلا اجازت جنگ کے لیے جا سکتا ہے۔ امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد، عبداللہ بن حرامؓ جنگ احد میں شہید ہو گئے ان پر بہت سا قرض تھا، ان کی طرف سے ان کے بیٹے حضرت جابرؓ نے قرض ادا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم میں یہ بات تھی، لیکن آپؐ نے ان کی کوئی مذمت نہیں کی، بلکہ ان کی مدح فرمائی اور فرمایا: فرشتے اپنے پروں سے انہیں سایہ کیے ہوئے تھے، یہاں تک کہ نوحے کی آواز نے فرشتوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ حضرت جابرؓ سے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو زندہ کیا اور براہِ راست بات کی۔[1]

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۲۸،۲۷/۱۳۔ عبداللہ بن حرامؓ سے متعلق اس حدیث کے لیے ملاحظہ ہو۔ بخاری: کتاب الجہاد، باب ظل الملائکۃ علی الشہید۔ مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل عبداللہ بن حرامؓ۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ قرض دار، دائن یعنی قرض دینے والے کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہیں جائے گا، اگر قرض فوری طور پر واجب الادا ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے موقف میں نہ ہو، اس لیے کہ اس کے ساتھ دائن کا حق وابستہ ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دائن جہاد میں شرکت کی اجازت تو دے مگر قرض معاف نہ کرے۔ ایسی صورت میں قرض دار کا اپنی جگہ رہنا (جہاد پر نہ جانا) مستحب ہے، تاکہ وہ قرض ادا کرسکے۔ اس لیے کہ قرض کا ادا کرنا زیادہ اہم ہے، اسے مقدم رکھنا چاہیے، لیکن اگر وہ دائن کی اجازت سے جہاد پر چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ دائن (قرض دینے والا) موجود نہ ہو اور قرض دار یہ وصیت کردے کہ اگر اس کی موت واقع ہوجائے تو اس کا قرض ادا کردیا جائے اور اس کا انتظام بھی عملاً ہو تو جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر ادائے قرض کا انتظام نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ جہاد پر نہ جائے۔ اس کے لیے اپنی جگہ قیام اولیٰ ہے، تاکہ بروقت قرض ادا کرسکے۔ لیکن اگر قرض مؤجل ہو، یعنی فوری ادائیگی ضروری نہ ہو تو قرض دار جہاد پر جاسکتا ہے، بشرطے کہ بہ ظاہر حالات اس بات کا امکان ہو کہ قرض کی ادائیگی کا جو وقت طے ہے، اس سے پہلے واپس آجائے گا۔ [۱]

قرض کے حکم میں دوسرے حقوق العباد بھی ہیں

ان تفصیلات کا تعلق قرض دار اور قرض خواہ دونوں سے ہے۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ اوپر جو احادیث گزری ہیں، ان میں صراحت ہے کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں، البتہ اس کے ذمے قرض ہو تو وہ معاف نہ ہوگا۔ قرض انسانوں کے حقوق میں ایک نمایاں حق ہے، اس پر دوسرے حقوق کو بہ آسانی قیاس کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جہاد میں شرکت اور شہادت سے انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ شرکت

---

[۱] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۶ ر ۲۰۴

سے پہلے ان حقوق وواجبات سے سبک دوش ہونا یا اس کا نظم کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ اس سلسلے کی حضرت ابوقتادہؓ کی روایت کے ذیل میں امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قَوْلُهُ ﷺ: إِلَّا الدَّيْنَ فَفِيهِ تَنْبِيهٌ عَلَى جَمِيعِ حُقُوقِ الْآدَمِيِّينَ وَأَنَّ الْجِهَادَ وَالشَّهَادَةَ وَغَيْرَهُمَا مِنْ أَعْمَالِ الْبِرِّ لَا يُكَفِّرُ حُقُوقَ الْآدَمِيِّينَ وَإِنَّمَا يُكَفِّرُ حُقُوقَ اللّٰهُ تَعَالَى [۱]

آپ ؐ کا یہ فرمان کہ قرض کے علاوہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے، اس میں انسانوں کے حقوق کے سلسلے میں خبردار کیا گیا ہے کہ جہاد اور شہادت وغیرہ نیک اعمال انسانوں کے حقوق کا کفارہ نہیں بنتے۔ اس سے بس اللہ کے حقوق معاف ہوں گے۔

علامہ شوکانیؒ کہتے ہیں:

وَيَلْحَقُ بِالدَّيْنِ مَا كَانَ حَقًّا لِآدَمِيٍّ مِنْ دَمٍ أَوْ عِرْضٍ بِجَامِعِ أَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ حَقٌّ لِآدَمِيٍّ يَتَوَقَّفُ سُقُوطُهُ عَلَى إِسْقَاطِهِ.[۲]

قرض ہی کے حکم میں انسان کا جو بھی حق ہے وہ آتا ہے، خواہ اس کا تعلق جان سے ہو یا عزت وآبرو سے۔ اس لیے کہ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان سب کا تعلق آدمی کے حق سے ہے۔ وہ اس کے ساقط کرنے ہی سے ساقط ہوں گے۔

علامہ تورپشتیؒ کا بیان اور زیادہ واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

أَرَادَ بِالدَّيْنِ هُنَا مَا يَتَعَلَّقُ بِذِمَّتِهِ مِنْ حُقُوقِ الْمُسْلِمِينَ، إِذْ لَيْسَ الدَّائِنُ أَحَقَّ بِالْوَعِيدِ وَالْمُطَالَبَةِ مِنْهُ مِنَ الْجَانِي وَالْغَاصِبِ وَالْخَائِنِ وَالسَّارِقِ.[۳]

دَین (قرض) سے آپ ؐ کی مراد مسلمانوں (اسی طرح غیر مسلموں) کے حقوق ہیں، جو اس کے ذمے ہیں۔ اس لیے کہ قرض دار وعید کا اور اس سے مطالبہ کا اتنا مستحق نہیں ہے جتنا مستحق کہ ایک قاتل، خائن اور چور ہے۔

۱؎ نووی، شرح مسلم المجلد السابع، الجزء الثالث عشر ص ۲۷

۲؎ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۲

۳؎ ملا علی قاری: مرقاۃ المفاتیح، ۷/ ۳۷۱

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں 'دَین' کی جگہ 'امانت' کا لفظ آیا ہے، جو زیادہ وسیع المعنی ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

الْقَتْل فِي سَبِيل الله يكفر الذُّنُوب كلهَا إِلَّا الأَمَانَة وَالأَمَانَة فِي الصَّلَاة وَالأَمَانَة فِي الصَّوْم وَالأَمَانَة فِي الحَدِيث وَأَشد ذَلِك الودائع[1]	اللہ کے راستے میں قتل ہونا تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، سوائے امانت کے۔ امانت نماز میں، امانت روزے میں اور امانت گفتگو میں۔ ان میں سب سے شدید وہ امانتیں ہیں جو کسی کے پاس رکھی جاتی ہیں۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آدمی پر دوسروں کے حقوق ہوں تو جہاد سے پہلے اسے ان کے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ انہیں نظر انداز کر کے جہاد میں شرکت درست نہ ہوگی۔ شہادت سے بھی یہ معاف نہ ہوں گے۔

اسلام نے فرد کے حقوق اور ریاست کی سیاسی ضروریات دونوں کو اہمیت دی ہے۔ اس نے مقاصد جہاد اور انسانی حقوق کے درمیان بے مثال توازن قائم کیا ہے۔ فرد اور ریاست دونوں ہی پابند ہیں کہ اس توازن کو برقرار رکھیں اور اسے نقصان نہ پہنچنے دیں۔

---

[1] رواہ الطبرانی وابونعیم باسناد صحیح (التیسیر بشرح الجامع الصغیر للمناوی: ۲/۲۰۱)

معذور پر جہاد فرض نہیں ہے

منافقین کے جھوٹے عذرات

سورۂ توبہ میں منافقین کا کردار بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ خاص طور پر جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بتایا گیا کہ ان کے اندر اس کے لیے قطعاً کوئی آمادگی نہیں ہوتی۔ جہاد کا حکم دیا جاتا ہے تو زمین سے چمٹے بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنی جگہ سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ (۳۸) کسی دور دراز کے محاذ پر جانا ہو تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں: لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (۴۲) (اگر ہم نکل سکتے تو آپ لوگوں کے ساتھ ضرور نکلتے)۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ محاذ جنگ پر جانا ہی نہیں چاہتے۔ اگر ان کا ارادہ ہوتا تو جنگ سے پہلے جو تیاری کرنی چاہیے وہ ضرور کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی نہ تھی کہ وہ اس پاک مقصد میں شریک ہوں۔ ان کی قسمت میں یہی تھا کہ (عورتوں، بچوں اور معذوروں کی طرح) یہ بھی گھروں میں بیٹھے رہیں۔ (۴۶) اس لیے کہ وہ جنگ میں شریک ہوتے بھی تو فساد ہی پھیلاتے۔ (۴۷) ان کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح و کامرانی سے انہیں تکلیف ہوتی ہے اور مسلمان کسی شکست سے دوچار ہوں یا انہیں کوئی گزند پہنچے تو خوشی مناتے ہیں اور اپنی ہوشیاری پر ناز کرتے ہیں کہ ہم اس مصیبت سے محفوظ رہے۔ (۵۰) اللہ کی راہ میں اپنا مال لگانا اور جہاد پر خرچ کرنا انہیں ناپسند ہوتا ہے اور اگر کبھی کچھ دینا ہی پڑے تو سخت ناگواری کے ساتھ دیتے ہیں۔ (۵۴) اللہ کے مخلص بندے اپنی محنت مزدوری کی کمائی اس کی راہ میں لگاتے ہیں تو اس پر طنز کرتے ہیں۔ (۷۹) موسم کی سختی بھی ان کے لیے عذر بن جاتی ہے۔

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ (۸۱) (اور کہتے ہیں کہ سخت گرمی میں نہ نکلو)۔

یہ اور اس نوعیت کے جھوٹے عذرات سے آدمی کے باطن کی کھوٹ اور اس کا نفاق ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حیلے بہانے اسی وقت تراشے جاتے ہیں جب کہ دل ایمان کی دولت سے محروم ہو اور اللہ کے دین کے لیے جان و مال کی قربانی کا جذبہ سرد پڑ چکا ہو۔

حقیقی معذورین

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کے ساتھ حقیقی عذرات بھی ہوتے ہیں۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ قرآن مجید نے جہاں منافقین اور ان کے جھوٹے عذرات بیان کیے ہیں، وہیں حقیقی معذورین کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ جہاد میں شریک نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (التوبہ: ۹۱)

(جہاد میں شریک نہ ہوں تو) کوئی حرج نہیں ہے ضعیفوں پر اور مریضوں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کے پاس جہاد کا خرچ اٹھانے کے لیے (مال) نہیں ہے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ نکوکاروں پر کوئی اعتراض نہیں اور اللہ بڑا معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔

عدمِ استطاعت سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے

یہ صراحت اس بات کی ہے کہ جو شخص معذور ہے اور جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا اس پر جہاد فرض نہیں ہے۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ کسی بھی حکمِ شریعت کا آدمی اسی وقت مکلّف ہوتا ہے جب کہ اس حکم کو انجام دینے کی اس میں استطاعت ہو۔ اگر استطاعت نہ ہو تو وہ اس کا مکلّف نہ ہوگا۔ علامہ قرطبیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اَلْاٰیَةُ اَصْلٌ فِیْ سُقُوْطِ التَّکْلِیْفِ عَنِ الْمَعْذُوْرِیْنَ فَکُلُّ مَنْ عَجَزَ عَنْ شَیْئٍ سَقَطَ عَنْهُ	آیت اس معاملہ میں اصل ہے کہ معذورین سے شرعی ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے۔لہٰذا جو شخص کسی چیز سے (کسی عمل کے ادا کرنے سے) عاجز ہے اس سے وہ ساقط ہوجائے گا۔

آگے فرماتے ہیں: تکلیف کے سقوط کی دو شکلیں ہیں: ایک یہ کہ ایک عمل کی جگہ دوسرا عمل رکھا جائے۔ دوسری یہ کہ اس کا تاوان یا فدیہ تجویز کیا جائے۔ مزید فرماتے ہیں: یہی بات لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ:۲۸۶) میں کہی گئی ہے۔ اللہ کسی بھی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔[۱]

معروف حنفی فقیہ علامہ علاء الدین کاسانیؒ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اِنَّهُ لَا یُفْتَرَضُ اِلَّا عَلَی الْقَادِرِ عَلَیْهِ فَمَنْ لَا قُدْرَةَ لَهُ لَا جِهَادَ عَلَیْهِ	جہاد اس شخص پر فرض ہے جو اس کی قدرت اور طاقت رکھتا ہو۔ جس کے اندر اس کی طاقت نہیں ہے اس پر جہاد فرض نہیں ہے۔

اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ جہاد کے معنیٰ ہیں اپنی پوری قوت صرف کرنا۔ جس شخص کو یہ قوت ہی حاصل نہیں ہے اس کے لیے اس کے صرف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسی لیے نابینا، لنگڑے، اپاہج، چلنے پھرنے سے معذور، پیرِ ناتواں، مریض، کم زور اور جو جہاد کے اخراجات برداشت کرنے کے موقف میں نہ ہو، ان میں سے کسی پر جہاد فرض نہیں قرار دیا گیا۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: بچے اور عورت پر بھی جہاد فرض نہیں ہے۔ اس لیے کہ جسمانی طور پر وہ اس کے متحمل نہیں ہیں۔[۲]

فقہ حنفی کی ایک اور معتبر کتاب درمختار میں ہے:

(ولا بد) لفرضیته (من) قید آخر وهو (الاستطاعة)[۳]	جہاد کی فرضیت کے لیے ایک اور شرط یعنی استطاعت ضروری ہے۔

---

[۱] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۴، جزء ۸، ص ۱۴۴

[۲] کاسانی، بدائع الصنائع: ۷/ ۱۴۶

[۳] رد المحتار مع در المختار: ۶/ ۲۰۵

معذورین کون ہیں؟

سورۂ توبہ کی زیر بحث آیت (۹۱) میں جہاد سے معذور جن افراد کا ذکر ہے وہ تین طرح کے ہیں:

۱- ضعفاء ۲- مرضیٰ ۳- نادار

آیت میں 'ضعفاء' اور 'مرضیٰ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ضعفاء، ضعیف کی اور مرضیٰ مریض کی جمع ہے۔ امام رازیؒ وغیرہ نے ضعیف اور مریض میں فرق کیا ہے۔ ضعیف وہ ہے جو جسمانی طور پر تو صحیح سالم ہو اور اس میں کوئی طبعی نقص یا عیب نہ ہو، لیکن کم زور اور ناتواں ہو اور جہاد میں حصہ نہ لے سکے، جیسے بوڑھے اور عمر رسیدہ افراد، عورتیں اور بچے۔ ضعیف وہ شخص بھی ہے جو پیدائشی طور پر نحیف، کم زور اور لاغر ہو اور جہاد کی مشقت نہ برداشت کر سکے۔ چناں چہ امام رازیؒ ضعیف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وَمَنْ خُلِقَ فِي أَصْلِ الْفِطْرَةِ ضَعِيفًا نَحِيفًا[۱] جو فطری طور پر ضعیف اور نحیف ہو۔

یہی بات علامہ علاء الدین خازنؒ نے کہی ہے:

وَمَنْ خُلِقَ فِي أَصْلِ الخِلقَةِ ضَعِيفًا نَحِيفًا[۲] جو پیدائشی طور پر ضعیف اور نحیف ہو۔

علامہ ابو حیان اندلسیؒ نے اس شخص کو بھی ضعفا میں شمار کیا ہے، جس کے اندر پیدائشی طور پر خوف کی کیفیت اور اس قدر ضعف و ناتوانی ہو کہ جہاد میں شرکت اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ کہتے ہیں:

وَمَنْ خُلِقَ فِي أَصْلِ البِنْيَة شديد المخافة والضؤولة، بِحَيْثُ لَا يُمْكِنُهُ الْجِهَادُ[۳] جس کی جسمانی ساخت ہی میں شدید خوف، ضعف اور ناتوانی پائی جائے، جس سے کہ اس کے لیے جہاد ممکن نہ ہو۔

۱۔ رازی، التفسیر الکبیر: جلد ۸، جزء ۱۶، ص ۱۲۷

۲۔ خازن: لباب التاویل فی معانی التنزیل ۱۷۲/۳

۳۔ ابو حیان، البحر المحیط: ۷۸/۵

مریض کے متعلق امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے نابینا، لولے لنگڑے اور اس نوعیت کے وہ تمام افراد مراد ہیں جو مرض کی وجہ سے جہاد کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ یہ فرق اس لیے کیا گیا ہے کہ قرآن مجید نے ضعفا اور مرضیٰ کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔[۱]

قرآن مجید میں ایک جگہ جہاد سے معذورین میں نابینا، لنگڑے اور مریض کا ایک ساتھ ذکر ہے، جس سے اوپر کے بیان کردہ فرق کی تائید نہیں ہوتی۔ ارشاد ہے:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (الفتح: ۱۷)

اندھے پر حرج نہیں ہے، نہ لنگڑے پر حرج ہے اور نہ مریض پر اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اسے وہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی اور جو روگردانی کرے اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔

اس بحث سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے مختلف نوعیت کے عذرات کا ذکر کیا ہے، ان میں بہر حال فرق بھی ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ مختلف جسمانی عذرات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ لنگ اگر نمایاں ہے اور دوڑ دھوپ اور سواری کا استعمال ممکن نہیں ہے تو یہ عذر قابل اعتبار ہے، لیکن معمولی لنگ جس کے ساتھ آدمی دوڑ لگا سکتا اور سواری کر سکتا ہو تو یہ عذر نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نابینا تو معذور ہے، لیکن ترچھا پن عذر نہیں ہے۔ یہی معاملہ مرض کا ہے۔ شدید مرض تو مانعِ وجوب ہے، لیکن معمولی مرض سے وجوب ختم نہیں ہوگا، جیسے دانت کی تکلیف یا ہلکا دردِ سر وغیرہ۔ کیوں کہ جہاد اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔[۲]

مریض دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کا مرض دائمی اور مستقل ہوتا ہے۔ نابینا، لولے لنگڑے اور اپاہج اسی میں آتے ہیں۔ دوسرے وہ مریض جن کے مرض کی

---

[۱] رازی: التفسیر الکبیر، جلد ۸، جزء ۱۶، ص ۱۲۷، نیز ملاحظہ ہو۔ خازن، تفسیر: ۱۷۲/۳

[۲] ابن قدامہ، المغنی: ۹/۱۳

نوعیت وقتی اور عارضی ہوتی ہے، جیسے شدید بخار، ایسی چوٹ اور زخم جس سے چلنا پھرنا اور حرکت کرنا دشوار ہو۔ اس نوعیت کے امراض کا علاج ہوسکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ ختم بھی ہوجاتے ہیں۔ آج کل تپ دق جیسے امراض بھی قابل علاج سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ جب مرض ختم ہوجائے اور صحت بحال ہوجائے تو صحت مند انسان متصور ہوگا۔[1]

مالی عدمِ استطاعت

جہاد کے وجوب کے لیے مالی استطاعت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ ○ (التوبۃ:۹۱)

اور ان پر بھی جہاد فرض نہیں ہے جو جہاد پر خرچ کے لیے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے۔

اس کے ذیل میں مفسر خازن کہتے ہیں:

يعني الفقراء العاجزين عن أهبة الغزو والجهاد، فلا يجدون الزاد والراحلة والسلاح ومؤنة السفر لأن العاجز عن نفقة الغزو معذور[2]

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ اور جہاد کا ساز و سامان کرنے سے عاجز ہوں، یعنی جو کھانے پینے کا سامان، سواری، ہتھیار اور سامان سفر نہ پاتے ہوں۔ اس لیے کہ جو شخص جنگ کے اخراجات برداشت نہ کرسکے وہ معذور ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب کہ آدمی کے پاس زادِ سفر، اسلحہ اور سواری جیسے لوازمات ہوں۔ اسی میں اہل و عیال اور جن افراد کی کفالت کی ذمہ داری آدمی پر ہے ان کا نان و نفقہ بھی شامل ہے۔ اس کا نظم نہیں ہے تو جہاد کا فرض عائد نہ ہوگا۔

---

[1] ملاحظہ ہو، رشید رضا، تفسیر المنار: ۵۸۶/۱۰

[2] خازن مع بغوی: تفسیر ۱۷۲/۳۔ ابن قدامہ، المغنی: ۹/۱۳، ۱۰

علّامہ ابن قدامہ حنبلیؒ سورۂ توبہ (۹۱) کی اسی آیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

اگر جہاد کے لیے قریب کا سفر کرنا پڑے تو شرط یہ ہے کہ آدمی کے پاس زادِ راہ ہو اور جب تک وہ گھر سے باہر ہے، گھر والوں کے نفقے کا انتظام ہو اور جنگ کے لیے اسلحہ ہو۔ قریب کے سفر کے لیے، جس میں نماز قصر نہ کی جا سکے، سواری ضروری نہ ہوگی، لیکن اگر مسافت اتنی ہے کہ اس میں قصر پڑھی جائے تو سواری کا بھی اعتبار ہوگا۔[1]

اگر کوئی شخص جہاد کے اخراجات نہ برداشت کر سکے اور حکومت اس کا نظم کر دے تو عذر ختم ہو جائے گا۔ لیکن حکومت اس موقف میں نہ ہو تو آدمی مجبور سمجھا جائے گا۔ جہاد میں شرکت اس کے لیے لازم نہ قرار پائے گی۔ چناں چہ حقیقی عذرات ہی کے ذیل میں یہ بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ۝ (التوبۃ: ۹۲)

اور نہ ان لوگوں پر کوئی حرج ہے کہ وہ جب آپ کے پاس اس لیے آئے کہ آپ ان کے لیے سواری فراہم کر دیں تو آپ نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمہارے لیے سواری فراہم نہیں کر سکتا (یہ سن کر) وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں اس غم میں آنسو بہا رہی ہیں کہ وہ خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکومت جہاد کے لوازمات پورے کر دے، مطلوبہ ساز و سامان فراہم کر دے اور اس کے اخراجات برداشت کرے تو مالی عدم استطاعت کا عذر ختم ہو جائے گا اور جن لوگوں کو جہاد کا حکم ہو ان کے لیے جہاد پر نکلنا لازم قرار پائے گا۔

فنی صلاحیت

جنگ کے لیے فنونِ جنگ سے واقفیت لازمی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بڑی اہمیت دی ہے۔ آپ نے تیر اندازی، گھڑ سواری اور شمشیر زنی سیکھنے اور اس کی

---

[1] ابن قدامہ: المغنی ۱۰۹/۱۳

مشق جاری رکھنے کی ترغیب دی اور تاکید فرمائی۔[1]

ان فنون کا تعلق آپؐ کے دور مبارک سے تھا۔ آج جنگ زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کے لیے فوجی تربیت ناگزیر ہے۔ ایک تربیت یافتہ فوجی ہی محاذِ جنگ پر اپنا فرض انجام دے سکتا ہے۔ فقہاء نے فنی صلاحیت کو لازم قرار دیا ہے۔ چناں چہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ردالمحتار میں ہے:

(وَشَرَطَ لِوُجُوبِهِ الْقُدْرَةَ عَلَى السِّلَاحِ) أَيْ وَعَلَى الْقِتَالِ[2] جہاد کے وجوب کے لیے شرط ہے کہ ہتھیار پر یعنی جنگ پر قدرت حاصل ہو۔

جو شخص یہ محسوس کرے کہ وہ محاذِ جنگ پر (بے فائدہ) مارا جائے گا یا گرفتار ہو جائے گا تو اس پر جہاد فرض نہیں ہے۔[3]

معذورین کے لیے شرکت کا جواز

قرآن مجید نے معذورین کے بارے میں فرمایا کہ وہ جہاد پر نہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ گناہ گار نہ قرار پائیں گے، یا وہ قابلِ ملامت نہ ہوں گے اور ان کی گرفت نہ ہوگی۔ یہ ایک طرح کی رخصت ہے، یا یوں کہا جائے کہ جہاد میں عدمِ شرکت کی انہیں اجازت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاد میں شرکت ان کے لیے ممنوع ہے اور وہ جہاد میں شریک ہوں گے تو گناہ گار ٹھہریں گے، یا ثواب سے محروم ہوں گے، بلکہ وہ کسی بھی درجہ میں معاون ہو سکتے ہوں تو اجر و ثواب کے یقیناً مستحق ہوں گے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

”عدمِ حرج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معذوروں کے لیے جہاد پر نکلنا

---

[1] اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] ابن عابدین: ردالمحتار علی الدر المختار: ۶/ ۲۰۵

[3] حوالہ سابق، ص ۲۰۶

حرام ہے۔ معذور شخص اگر اس خیال سے جہاد میں شریک ہو کہ وہ اپنی طاقت کی حد تک مجاہدین کی مدد کرے گا، ان کے ساز و سامان کی حفاظت کرے گا، یا لشکر کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوگا اور وہ مجاہدین پر بوجھ نہیں بنے گا تو اس کی خدمت عند اللہ مقبول ہوگی۔‘‘[۱]

یہی بات اور مفسرین نے بھی کہی ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسیؒ اس کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمرو بن جموحؓ کے پیر میں لنگ تھا۔ ان کا انصار کے متقی اور خدا ترس افراد میں شمار ہوتا تھا۔ وہ لشکر میں سب سے آگے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تو تمہیں معذور قرار دیا ہے (تم کیوں اس قدر تکلیف برداشت کر رہے ہو) انھوں نے عرض کیا! خدا کی قسم میں تو اپنے اسی لنگ کے ساتھ اچھلتا ہوا جنت میں جاؤں گا۔ حضرت عبداللہ بن امّ مکتومؓ نابینا تھے۔ جنگِ احد میں شریک ہوئے۔ درخواست کی کہ علم انہیں عطا کیا جائے۔ چناں چہ علم ہاتھ میں لیا۔ جب وہ ہاتھ زخمی ہو گیا تو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ جب وہ بھی زخمی ہو گیا تو علم کو سینہ سے لگا کر پکڑے رہے (اور گرنے نہ دیا)۔[۲]

عدمِ شرکت پر افسوس

جہاد میں عدمِ شرکت کے لیے حقیقی عذر ہو سکتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس بات پر مسرت اور راحت محسوس کرے کہ اس کی جان بچی اور اس راہ کی آزمائشوں سے وہ محفوظ رہا۔ اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اسے یہ احساس دامن گیر ہو کہ وہ ایک بڑے کارِ ثواب سے محروم رہا۔ اسے یہ جذبہ بے تاب کر رہا ہو کہ وسائل ہوتے اور وہ معذور و بے بس نہ ہوتا تو جہاد کی سعادت سے بہرہ ور ہوتا، اللہ کے دین کی راہ میں مال

---

[۱] رازی: التفسیر الکبیر جلد ۸، جزء ۱۶، ص ۱۲۷

[۲] ابوحیان، البحر المحیط: ۵/ ۸۷۔ نیز ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۴، جزء ۸، ص ۱۴۴

خرچ کرتا اور جان کی بازی لگاتا۔ غزوۂ تبوک میں بعض مخلص اہل ایمان شریک نہ ہو سکے، اس لیے کہ ان کے پاس اس لمبے سفر کے لیے سواری نہیں تھی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سواری کی درخواست کی۔ آپ نے معذرت فرمادی۔ اس وقت ان کی جو کیفیت تھی اور جو ایک مومن کی کیفیت ہونی چاہیے وہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ○ (التوبہ: ۹۲)

وہ (آپ کے پاس سے) اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے غم کے آنسو بہہ رہے تھے کہ وہ اس کے اخراجات نہیں پا رہے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس طرح کے حقیقی معذورین کو جہاد میں شریک نہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ (ان کی نیت اور جذبہ کا) اجر و ثواب ضرور عطا کرے گا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب پہنچ کر فرمایا کہ مدینہ میں وہ لوگ بھی ہیں کہ تم جس جگہ بھی گئے، جو وادی بھی تم نے طے کی اور جو خرچ بھی تم نے کیا وہ تمہارے ساتھ رہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ وہ مدینہ ہی میں ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کو (حقیقی) عذر نے جنگ میں شریک ہونے سے روک دیا۔[1]

نصح و خیر خواہی

جو لوگ جہاد میں شریک نہ ہوں ان کا عذر اسی وقت معتبر ہوگا جب کہ وہ اللہ اور رسول کے ساتھ خیر خواہی کا ثبوت دیں۔ چناں چہ اسی آیتِ زیر بحث (التوبہ:۹۱) کے آخر میں اس شرط کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

---

[1] بخاری: کتاب الجہاد، باب من حبسہ العذر من الغزو۔ مسلم: کتاب الامارة، باب ثواب من حبسہ عن الغزو الخ۔ ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب الرخصة فی القعود عن العذر۔

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ   جب کہ وہ خیر خواہ ہوں اللہ اور اس کے رسول کے۔ نکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے۔

آیت میں 'نصح' کا لفظ آیا ہے۔ کسی کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کی جو ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں وہ سب 'نصح' میں داخل ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ اور رسول کے ساتھ خیر خواہی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سوال یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں گئے بغیر اپنے مقام پر رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کیا خیر خواہی ہو سکتی ہے؟ علماء نے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ ابو بکر جصاص حنفیؒ کہتے ہیں کہ معذورین کا عذر اس شرط کے ساتھ قابلِ قبول ہوگا اور وہ مستحق ستائش بھی ہوں گے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ ہوں۔ اس کے برخلاف جو شخص جہاد میں شریک نہ ہو، میدان جنگ سے پیچھے رہ جائے اور مدینہ میں موجود لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرتا رہے، ان کے اندر فساد پھیلائے، وہ قابل مذمت اور مستحق عذاب ٹھہرے گا۔ اللہ اور رسول کے ساتھ نصح و خیر خواہی کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی جائے، انہیں اس کے لیے آمادہ کیا جائے، ان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور ایسے اقدامات کیے جائیں، جن سے ان کے دین کو فائدہ پہنچے، ساتھ ہی اس کے اندر اخلاص پایا جائے اور اس کے اعمال ریا کاری سے پاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آخر میں اصولی بات فرمائی ہے:

مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ جو محسن اور نکوکار ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں۔ [1]

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ معذورین کے میدانِ جہاد سے پیچھے رہ جانے کا جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا رویہ اختیار کریں۔ (جہاد کے سیاق میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہر میں افواہیں پھیلانے

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۱۸۶/۳

سے احتراز کریں، فتنہ وفساد نہ بھڑکائیں، مجاہدین کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں، ان کے خانگی امور کو درست رکھیں، مجاہدین تک ان کے اہل وعیال کی خیر وعافیت کی خبریں پہنچائیں۔ یہ ساری چیزیں جہاد میں اعانت کے حکم میں آتی ہیں۔[۱]

اسلام نے جہاد کے جو اعلیٰ مقاصد متعین کیے ہیں ان کی تکمیل کے لیے وہ اپنے ماننے والوں سے سخت جدوجہد اور جان ومال کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے جس فرد یا گروہ پر جہاد فرض ہو جائے اس سے اس کا جی چرانا اور حیلے بہانے کرنا اس کے نزدیک ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت ہے۔ یہ ریاست سے غداری کے بھی ہم معنیٰ ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انسان کی طبعی معذوریوں اور حقیقی مجبوریوں کی بھی پوری رعایت کی ہے، اس نے کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ جہاد کی پوری تعلیم کو سمجھنے کے لیے اس پہلو سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

---

[۱] رازی، التفسیر الکبیر: جلد ۸، جزء ۱۶، ص ۱۲۷

جہاد سے پہلے دعوتِ اسلام ضروری ہے

جہاد سے پہلے اسلام کی دعوت ضروری ہے، تاکہ جس قوم سے جہاد کیا جائے اسے معلوم ہو کہ اسلام کیا ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس کی جنگ یا جہاد کی کیا بنیاد ہے؟ اور وہ کیوں جنگ کر رہا ہے؟ اس کے بغیر اسلامی ریاست کے لیے کسی ملک کے خلاف تلوار اٹھانے کا جواز نہیں ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی بھی نافرمان اور غلط کار قوم پر اس کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب اللہ کا رسول اس پر دینِ حق پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور وہ حق کے اچھی طرح واضح ہونے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن مجید میں متعدد مواقع پر بیان ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (الاسراء:۱۵)

ہم (کبھی) عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیجیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ○ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ (الشعراء:۲۰۸، ۲۰۹)

ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ اس کے پاس ڈرانے والے نصیحت کے لیے بھیجے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

سورۂ قصص میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ

تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کی مرکزی بستی میں رسول نہ بھیجے، جو انہیں ہماری آیتیں

اٰیٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○ (القصص:۵۹)، پڑھ کر سنائے۔ ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس وقت جب کہ ان کے لوگ ظالم ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روم و فارس یا جن ممالک سے بھی جنگ کرنی پڑی، پہلے آپؐ نے انہیں اسلام کی باقاعدہ دعوت دی، اس کے لیے خطوط لکھے، پھر ان سے جنگ ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے:

مَا قَاتَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا حَتَّى يَدْعُوَهُمْ [1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی قوم سے جنگ نہیں کی جب تک کہ اسے دعوت نہ دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

مَا قَاتَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَوْمًا قَطُّ إِلا دَعَاهُمْ [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی قوم سے کبھی جنگ نہیں کی مگر اسی وقت جب کہ انہیں دعوت دی۔

فروہ بن مسیک المرادیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میری قوم کے جو لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کریں انہیں ساتھ لے کر کیا ان لوگوں سے جو اسلام سے روگردانی کریں جنگ کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! جب میں واپس ہونے لگا تو آپ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا:

لَا تُقَاتِلْهُمْ حَتَّى تَدْعُوَهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ [3] ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ تم انہیں اسلام کی دعوت نہ دو۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دینا

---

[1] مسند احمد: ۱/ ۳۸۳۔ دارمی: کتاب السیر، باب فی الدعوۃ الی الاسلام قبل القتال۔ یہ حدیث طبرانی، ابویعلی اور مستدرک حاکم میں بھی آئی ہے۔ نیل الاوطار: ۷/ ۲۶۲

[2] مسند احمد: ۱/ ۳۹۰ حدیث نمبر ۲۱۰۶

[3] رواہ احمد و ابوداؤد والترمذی وحسنہ۔ نیل الاوطار: ۷/ ۲۶۴، اس موضوع سے متعلق روایات کے لیے ملاحظہ ہو۔ زیلعی: نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ مع الہدایۃ ۳/ ۵۸۱

ضروری نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنوالمصطلق پر اچانک حملہ کیا۔ ان کو پہلے سے اس کی اطلاع نہیں تھی۔[1]

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ جَوَازُ الْإِغَارَةِ عَلَى الْكُفَّارِ الَّذِينَ بَلَغَتْهُمُ الدَّعْوَةُ مِنْ غَيْرِ إِنْذَارٍ بِالْإِغَارَةِ[2]

جن کفار تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے ان پر بغیر اطلاع کے بعد بھی حملہ ہوسکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بنو مصطلق کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی اور وہ اس سے واقف تھے۔

بنوالمصطلق کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کرر ہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے اچانک ان پر حملہ کردیا۔ یہ اقدام ریاست کے تحفظ کے لیے تھا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں فقہاء کے تین مسلک ہیں:

ایک یہ کہ جنگ سے پہلے 'انذار' ہر حال میں ضروری ہے۔ یہ امام مالکؒ وغیرہ کا مسلک ہے، لیکن یہ کم زور ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ جنگ کے لیے انذار کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ یہ پہلے سے بھی کم زور بلکہ باطل ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ جس قوم سے جنگ ہو، اگر اسے اسلام کی دعوت نہیں دی گئی ہے تو اسے دعوت دینا لازم ہے۔ اگر اس تک دعوت پہنچ چکی ہے تو واجب نہیں ہے، البتہ پسندیدہ ہے۔ یہی مسلک صحیح ہے۔ یہ حضرت نافع، حسن بصری، ثوری، لیث بن سعد، امام شافعی، ابوثور، ابن المنذر اور جمہور کی رائے ہے۔ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی

---

[1] بخاری: کتاب العتق، باب من ملک من العرب رقیقاً۔ مسلم: کتاب الجہاد، باب جواز الاغارة علی الکفار الخ

[2] نووی، شرح مسلم: ج ۶، جزء ۱۲، ص ۳۳

ہے۔ ان میں بنوالمصطلق سے متعلق روایت بھی ہے۔ (یعنی وہ پہلے اسلام سے واقف تھے)۔[۱]

علامہ شوکانیؒ نے بھی فقہا کے مسالک کی تقریباً یہی تفصیل پیش کی ہے اور آخری مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔[۲]

علّامہ ابن رشدؒ فقہا کے خیالات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جہاد کی شرط بالاتفاق یہ ہے کہ جس قوم سے جہاد ہو پہلے اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول 'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا' ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کسی قوم سے ایک سے زائد بار جنگ ہو تو کیا ہر مرتبہ اسے اسلام کی دعوت دی جائے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے ہر مرتبہ دعوت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ ہر بار دعوت پیش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ واجب ہے اور نہ مستحب۔[۳]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر میں تو فقہا کا قریب قریب اتفاق ہے کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت لازماً دی جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جس قوم تک اسلام کا پیغام ایک مرتبہ پہنچ چکا ہے، اس سے جب بھی جنگ ہو، ہر مرتبہ اس کے سامنے اسلام کا پیش کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

فقہاء احناف کے ہاں اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث ملتی ہے۔ امام کاسانیؒ کہتے ہیں:

جنگ میں دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کا پیغام اس تک

۱۔ نووی: شرح مسلم، جلد ۶، جزء ۱۲، ص ۳۳

۲۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷ / ۲۶۲

۳۔ ابن رشد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد: ۱ / ۳۳۳

پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں پہنچا ہے تو پہلے وہ پہنچانا ہوگا۔ اسلام کی دعوت سے پہلے جنگ جائز نہ ہوگی۔ [۱]

علامہ ابن الہمامؒ کہتے ہیں کہ جس قوم سے جنگ ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جنگ لوٹ مار، یا ان کو اور ان کے بال بچوں کو غلام بنانے کے لیے نہیں ہو رہی ہے۔ (بلکہ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے) اس کا ذریعہ دعوت ہی ہے۔ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسلام ان کے لیے قابل قبول ہو جائے اور جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس لیے پہلے دین حق کا واضح کر دینا ضروری ہے۔ [۲]

ایک مسئلہ یہ بھی فقہا کے سامنے رہا ہے کہ اگر کسی قوم کی طرف سے اسلامی ریاست پر اچانک حملے کا اندیشہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی اسلام کی دعوت دینے کے بعد ہی اس کے خلاف فوجی کارروائی درست قرار پائے گی، یا اس کے بغیر بھی اس کا جواز ہے؟ فقہاء نے کہا ہے کہ اس صورت میں بغیر دعوت کے بھی اسلامی ریاست جنگی اقدام کر سکتی ہے۔ چنانچہ ابن ہمامؒ اوپر کی بحث ہی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم سے اس بات کا اندیشہ ہو کہ دعوت دینے اور اس کا ردعمل جاننے میں جو وقت صرف ہوگا، اس میں وہ تیاری کر کے ریاست پر حملہ کر دے گی تو دعوت دیے بغیر بھی اس کے خلاف کارروائی ہوسکتی ہے۔ [۳]

علامہ ابن عابدینؒ نے بھی اختصار کے ساتھ یہی بات کہی ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست کا محاصرہ ہو تو حملہ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ اگر اس تک دعوت پہنچ چکی ہے تو ایسا کرنا مندوب اور پسندیدہ ہوگا اور اگر دعوت نہیں پہنچی ہے تو واجب ہوگا، بشرطے کہ اس سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ (مطلب یہ کہ دعوتی عمل میں ریاست کو ضرر پہنچنے کا

---

[۱] کاسانی، بدائع الصنائع: ۷/ ۱۴۸

[۲] ابن الہمام: فتح القدیر ۵/ ۴۲۹

[۳] حوالہ سابق

خطرہ ہوتو بغیر دعوت کے بھی جنگی کارروائی کی جا سکتی ہے) اس کے بعد علامہ ابن ہمامؒ کی رائے نقل کردی ہے۔[1]

جنگ سے پہلے دعوت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ جس قوم کو دعوت دی جائے، ایک خاص وقت تک اس کا ردعمل دیکھا جائے۔ اس کا منفی ردعمل سامنے آنے پر اس سے جنگ کی جائے۔ دوسری صورت یہ کہ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہوں اور اسی حال میں اسلامی فوج کی طرف سے فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہ نازک ترین حالات میں اسلام کی دعوت ہوگی۔ دونوں ہی صورتیں حسب موقع اختیار کی جا سکتی ہیں اور غالباً اختیار بھی کی گئیں۔

جن قوموں کو جنگ سے پہلے دعوت دی گئی، ان کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں: ایک یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ ان کے حقوق اور ذمے داریاں وہی ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں کی ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ قبائلِ عرب سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان کا شمار مہاجرین میں ہوگا۔ مہاجرین ہی کی طرح ان سے معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اپنے علاقے ہی میں رہنا چاہیں تو جہاد میں ان کی شرکت نہ ہو سکے گی اور مالِ غنیمت میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ اگر اسلام قبول نہ کریں تو اسلامی اقتدار کو تسلیم کریں اور جزیہ ادا کریں۔ تیسری صورت یہ کہ اگر وہ ان دونوں باتوں کو رد کردیتے ہیں تو ان سے جنگ ہوگی۔

صحیح مسلم اور صحاح کی بعض دوسری کتابوں کی روایت ہے۔ سلیمان بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی لشکر بھیجتے تو امیر لشکر کو تقویٰ کی اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے، جنگ میں انہیں اخلاقی حدود کا پابند رہنے کا حکم دیتے، اس

---

[1] ابن عابدین، ردالمحتار علی الدرالمختار: ۶/ ۲۰۷، ۲۰۸

کے بعد ارشاد ہوتا:

وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ -أَوْ خِلَالٍ- فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الإِسْلَامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ، وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوا مِنْهَا، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ، يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللهِ الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، وَلَا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ، فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَقَاتِلْهُمْ[1]

جب تمہارا سامنا مشرک دشمنوں سے ہو تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو۔ ان میں سے جس بات کو بھی وہ اپنے لیے پسند کریں تم اسے قبول کرلو اور جنگ سے باز آ جاؤ۔ (پہلے) انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسے اختیار کرلیں تو تم اسے تسلیم کرلو اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ پھر اس بات کی دعوت دو کہ وہ اپنے علاقے سے 'دارالمہاجرین' (مدینہ) منتقل ہو جائیں۔ انہیں بتاؤ اگر وہ ہجرت کر جائیں تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین کی ہیں۔ اگر وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوں تو انہیں بتاؤ کہ ان کی حیثیت اعرابِ مسلمین کی ہوگی جن پر اللہ کے احکام جاری ہوں گے جو تمام مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں۔ لیکن غنیمت اور فَی میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا، الّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ اگر وہ اس سے انکار کردیں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں تو اسے قبول کرلو اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ لیکن وہ اگر اس کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کرو اور ان سے جنگ کرو۔

ہجرت کا حکم فتح مکہ سے پہلے تھا۔ جزیہ کا تعلق اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین سے ہے۔ یہاں مشرکین سے جزیہ پر صلح کا ذکر ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جزیہ اہل کتاب سے بھی لیا جاسکتا ہے اور مشرک اور بت پرست اقوام سے بھی۔ امام

---

[1] مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث الخ۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔ ترمذی: کتاب السیر، باب ماجاء فی وصیۃ فی القتال۔

اوزاعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ کی بھی تقریباً یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوائے مرتد کے سب سے جزیہ کی بنیاد پر صلح ہو سکتی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جزیہ صرف اہلِ کتاب اور مجوس سے لیا جا سکتا ہے، چاہے ان کا تعلق عرب سے ہو یا عجم سے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب سے تو جزیہ نہیں لیا جائے گا، ان کے علاوہ عجم سے جزیہ کی بنیاد پر صلح ہو سکتی ہے۔[1]

اس بحث میں دعوت، جزیہ اور جہاد کی جو ترتیب بیان ہوئی ہے اس پر علما کا اتفاق ہے۔[2]

فقہ مالکی کی کتاب 'الشرح الصغیر' میں کہا گیا ہے کہ جہاد سے پہلے اسلامی فوج فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دے گی، چاہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اس سے قبل پہنچ چکا ہو۔ ایک رائے یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اسی صورت میں دی جائے گی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس تک نہ پہنچی ہو۔ دعوت سے قبل ہی فریق مخالف خود سے جنگ شروع کر دے تو اسلامی فوج جوابی کارروائی کرے گی۔ دعوت کے نتیجے میں اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اپنی جگہ امان میں رہے گی۔ اگر دعوت کا انکار کر دے تو اس سے جزیہ کا مطالبہ ہوگا۔ اس کے لیے وہ تیار ہو جائے تو جنگ نہیں ہوگی۔ جزیہ کے لیے بھی وہ تیار نہ ہو تو اس صورت میں اس سے جنگ کی جائے گی۔[3]

دورِ اوّل کی صورت حال کے پیش نظر بعض علما نے کہا ہے کہ آج اسلام سے کون

۱۔ خطابی، معالم السنن مع ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔ نووی، شرح مسلم المجلد السادس، الجزء الثانی عشر، ص ۳۵

۲۔ اسلامی ریاست میں ذمی کی حیثیت اور جزیہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث ذمیوں کے حقوق، ص ۲۱۵ تا ۲۵۰

۳۔ احمد الدردیر، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک مع حاشیہ الصاوی: ۲/ ۲۷۵۔ فقہی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۹-۳۳

واقف نہیں ہے۔ وہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا پیغام اور اس کے مقاصدِ جنگ معلوم ومعروف ہیں۔ یہ دعوت دینے ہی کے ہم معنیٰ ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کی دعوت سب ہی لوگوں تک پہنچ چکی اور عام ہوچکی ہے۔ میرے علم میں اب کوئی نہیں ہے جو اسلام سے ناواقف ہو، اس لیے جنگ سے پہلے دعوت دینا ابتداءِ اسلام میں تو ضروری تھا، اب نہیں رہا۔

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ روم اور فارس کی سرحدوں سے آگے ایسے لوگ ہیں جن تک دعوت نہیں پہنچی ہے تو دعوت دینا ضروری ہوگا، اس سے قبل ان سے جنگ صحیح نہ ہوگی۔ اگر کسی قوم کو دعوت پہنچ چکی ہے تو ازسرنو دعوت دینا بہرحال مستحب اور پسندیدہ ہے۔[۱]

ساتویں صدی کے معروف حنفی فقیہ علامہ ابن الہمامؒ کے نزدیک گو اسلام کا تعارف وسیع پیمانہ پر ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی دعوت ساری دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک اور افراد بھی ہیں جنہیں اس کا شعور ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان تک دعوت نہیں پہنچی ہے۔ ہاں! اگر ان کو دعوت پہنچ چکی ہے تو انہیں دعوت دینا واجب نہ ہوگا، بلکہ استحباب کے حکم میں ہوگا۔[۲]

امام مالکؒ کے ہاں یہ بات زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں: اسلامی ریاست سے قریب کی ریاست سے تو جنگ بغیر دعوت کے ہوسکتی ہے، اس لیے کہ اسلام پھیل چکا ہے، قریب کے لوگ اس سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن جو لوگ دور کی ریاستوں میں ہیں، (ان کا اسلام سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے) اس لیے انہیں دعوت دینی ہوگی۔ یہ اسلام اور جہاد کے بارے میں شکوک وشبہات کو ختم کرنے کا بڑا

---

[۱] ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۹

[۲] ابن الہمام، فتح القدیر: ۵/ ۴۲۹

ذریعہ ہے۔[1]

ان تفصیلات سے یہ بات قطعیت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست سے جنگ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دے۔ اس کے بغیر اس کے خلاف فوجی اقدام صحیح نہیں ہے۔ ہاں، اگر اسلامی ریاست پر کوئی غیر اسلامی ریاست حملہ آور ہو، یا اس کے حملہ کا شدید اندیشہ ہو تو اسے اپنے دفاع کا حق ضرور حاصل ہوگا۔

سربراہانِ مملکت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکاتیب کی نوعیت

اب آیئے، اس سوال پر غور کیا جائے کہ کسی غیر اسلامی ملک کو دعوتِ اسلام کا مطلب کیا ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ مدعو قوم سے صرف یہ معلوم کیا جائے گا کہ وہ اسلام یا جزیے میں سے کس چیز کو اختیار کرے گی؟ ان دونوں میں سے کسی کو وہ قبول نہ کرے تو اس سے جنگ ہوگی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سربراہان ممالک کو جو مکاتیب ارسال فرمائے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں ان مکاتیب کے مضمون سے بحث نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا پیش نظر ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ مکاتیب ارسال فرمائے، یا اسلامی فوج کو یہ ہدایات دی تھیں، اس وقت اسلامی ریاست عملاً موجود تھی۔ آپ اس کے سربراہ تھے۔ آپ نے اسی حیثیت میں یہ خطوط روانہ فرمائے۔ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اسلام غیر متعارف نہیں تھا، بلکہ اس کا وسیع تعارف ہو چکا تھا۔ بہت سی قومیں اور قبائلِ عرب اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اسی بنیاد پر ان سے کش مکش جاری تھی۔ جو قومیں تفصیل سے اسلام سے واقف نہیں تھیں وہ آسانی سے اسے سمجھ سکتی تھیں۔[2]

---

[1] ابن حجر، فتح الباری، ۲۰۹/۶ [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوتی مکاتیب پر راقم نے 'اوراقِ سیرت' (ص ۲۸۱-۳۰۸) میں اس پہلو سے کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

کسی ریاست کا وجود بذات خود اس کے نظریات کے تعارف کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے طویل دعوتی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امریکہ اور مغربی ملکوں کا وجود اور ان کا نظام حکومت خود ظاہر کرتا ہے کہ وہ جمہوریت اور سرمایہ داری کے علم بردار ہیں اور اسی کی بنیاد پر ان کا پورا نظام قائم ہے۔ کمیونزم اور اس کے اصول ونظریات کو کمیونسٹ ممالک اور ان کے نظام حکومت کے ذریعہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جمہوری ممالک جمہوریت کی یا کمیونسٹ ممالک کمیونزم کی دعوت دیتے ہیں تو ان کے پیچھے پوری ریاست ہوتی ہے۔ انہیں اپنی بات سمجھانے کے لیے اس طرح دلائل کی ضرورت نہیں پیش آتی جس طرح کسی ایسے نظریہ کے سلسلہ میں درکار ہوتی ہے جس کے پیچھے کوئی اقتدار یا ریاست نہ ہو۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ (۶۰) کے قریب مسلم ممالک ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی حقیقی معنیٰ میں اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے؟ کیا وہاں اسلام اس طرح جاری وساری ہے کہ اسے دیکھ کر اسلام کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جاسکے؟ پھر کیا ان میں سے کسی ملک نے دور ونزدیک کے کسی غیر مسلم ملک پر اسلام کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جہاد کا تذکرہ تو ہے، لیکن جہاد کے لیے جو شرط لازم ہے وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

غیر اسلامی ریاست میں جہاد نہیں ہے

جہاد کا تعلق فرد اور ریاست دونوں سے ہے۔ ایک مسلمان کسی غیر اسلامی ریاست کا شہری ہو تو اس کے احکام الگ ہیں، اگر وہ اسلامی ریاست کا باشندہ ہے تو اس کے احکام جدا ہیں۔ اسی طرح اسلامی ریاست کا معاملہ ہر غیر اسلامی ریاست کے ساتھ یکساں نہیں ہوگا، بلکہ ان سے تعلقات کی نوعیت پر منحصر ہوگا۔ ان کے احکام بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

جو مسلمان کسی غیر اسلامی ریاست کا شہری ہے اور وہاں اسے دین کے اظہار و اعلان اور دعوت و تبلیغ کے مواقع حاصل ہیں تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے دین پر قائم رہے اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتا رہے۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرے۔ اگر کسی ملک میں اس کے مواقع ہی موجود نہ ہوں تو جہاں مواقع ہوں وہاں ہجرت کر جائے۔ کسی غیر اسلامی ملک میں رہتے ہوئے جہاد کا کوئی جواز نہیں ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا نمونۂ عمل

اللہ تعالیٰ کے رسول جن قوموں میں مبعوث ہوئے وہ کفر و شرک میں مبتلا تھیں

---

[۱] ہجرت کس وقت لازم قرار پاتی ہے؟ کب اس کا جواز رہتا ہے؟ اور موجودہ بین الاقوامی حالات میں ہجرت کے کیا امکانات ہیں؟ اس کی وضاحت اس سے پہلے ہو چکی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی قائل نہیں تھیں۔ وہ اس سے بے نیاز ہوکر اپنی خود ساختہ راہوں پر چل رہی تھیں۔ باپ دادا کے طریقے اور قدیم روایات ان کے لیے سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اُن سے وہ ہٹنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ ان قوموں میں اللہ کے رسولوں نے اس کے دین پر جس طرح عمل کیا اور اس کے احکام کی جس طرح پابندی کی اس سے یہ راہ نمائی ملتی ہے کہ کسی غیر اسلامی ماحول یا غیر اسلامی ملک میں ایک صاحبِ ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اور اسے کیسی زندگی گزارنی چاہیے؟

قرآن مجید میں اللہ کے رسولوں کی تاریخ۔ کسی کی اختصار سے اور کسی کی تفصیل سے۔ بیان ہوئی ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ کے رسولوں نے اس کے دین کی دعوت دی تو بہت تھوڑے لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کا ساتھ دیا۔ برسرِ اقتدار طبقہ نے اور اس کی اتباع میں اکثریت نے مخالفت شروع کر دی۔ وقت کے ساتھ یہ مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ انہیں ہر طرح کی اذائیتیں دی گئیں اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ انہیں دھمکی دی گئی کہ وہ دینِ کفر وشرک اختیار کرلیں، ورنہ انھیں ملک بدر کر دیا جائے گا۔ حضرت شعیبؑ سے کہا گیا:

لَنُخۡرِجَنَّكَ یٰشُعَیۡبُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَكَ مِنۡ قَرۡیَتِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوۡ كُنَّا كٰرِهِیۡنَ ۝ (الاعراف:۸۸)

ہم تمہیں اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں انہیں ضرور اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ شعیب نے کہا: (کیا تم ہمیں اس کے لیے مجبور کرو گے) اگرچہ ہم (اسے دلیل کی بنا پر) ناپسند ہی کر رہے ہوں۔

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوتِ توحید اور اخلاقی تعلیم کا جو ردِ عمل سامنے آیا وہ یہ تھا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡیَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوۡنَ ۝ (النمل:۵۶)

اس کی قوم کا جواب بس یہ تھا کہ انھوں نے کہا: لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بہت پاک باز بنتے ہیں۔

یہ صورتِ حال اللہ کے دوسرے رسولوں کے ساتھ بھی پیش آئی۔ چناں چہ ایک جگہ عمومی انداز میں کہا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (ابراہیم: ۱۳)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی انھوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم یقیناً تمھیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ۔ اس پر ان کے رب نے ان پر وحی نازل کی کہ ہم ضرور ظالموں کو ہلاک کریں گے۔

بعض اوقات اللہ کے رسولوں کے قتل کے منصوبے بھی تیار ہوئے، انہیں ہجرت بھی کرنی پڑی۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا بطورِ خاص ذکر موجود ہے۔ (الصافات: ۹۹) جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو بالکل ٹھکرا دیا اور انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہوگئے ان پر اللہ کا عذاب آیا اور وہ تباہ کردی گئیں۔ اللہ کے رسول اور ان کے ساتھی اس سے محفوظ رہے۔ ایک جگہ اللہ کے رسولوں کی مخالفت اور اس کے انجام کا ذکر چند لفظوں میں بیان ہوا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الروم: ۴۷)

ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول ان کی قوموں کے پاس بھیجے۔ وہ ان کے پاس دلائل کے ساتھ پہنچے (لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کردی) تو ہم نے ان لوگوں سے جو مجرم تھے انتقام لیا (اور اہل ایمان کی مدد کی) ہم پر حق تھا کہ اہل ایمان کی مدد کریں۔

یہ سب کچھ ہوا، لیکن کسی رسولِ خدا اور اس کے ماننے والوں کو اپنی قوم کے درمیان رہتے ہوئے نہ تو جہاد کا حکم دیا گیا اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہی ہے کہ انھوں نے جہاد کیا۔ اس کے سمجھنے میں ہمیں حضرت موسیٰؑ کی سیرت سے خاص طور پر رہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی سیرت سے راہ نمائی

حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ توحید کو فرعون نے خیال کیا کہ یہ اسے اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش ہے۔ چناں چہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات دیکھنے کے بعد اس نے اپنے درباریوں اور اعیانِ سلطنت سے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا:

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۝ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖۗ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (الشعراء: ۳۴،۳۵)

فرعون نے ان سرداروں سے، جو اس کے اطراف تھے، کہا کہ بے شک یہ خوب جاننے والا جادوگر ہے۔ یہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں اپنی زمین سے نکال دینا چاہتا ہے۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟

فرعون کے درباریوں اور اس کی قوم کے سرداروں نے اس کی تائید کی اور کہا کہ موسیٰؑ اور ان کی قوم، آپ کے اور آپ کے معبودوں کے خلاف ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کا موقع دینا اور ان سے صرفِ نظر کرنا بڑی نادانی ہوگی۔ اس فکرمندی کے جواب میں فرعون نے کہا: گھبرانے اور پریشان ہونے کی بات نہیں، ہم ان کی نسل ہی کا خاتمہ کردیں گے اور انہیں سر اٹھانے نہ دیں گے۔ یہ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے:

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۲۷)

فرعون نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ ہمیں ان پر اقتدار اور قوت حاصل ہے۔

اس سے پہلے بھی فرعون یہی کچھ کررہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب اسے مزید زور اور قوت سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ساحرانِ مصر نے بھی شروع میں یہی کہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ جادوگر ہیں اور اپنے جادو کے زور سے آپ کو ارضِ مصر سے نکال باہر کرنا اور آپ کی روایات اور پسندیدہ طریقوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں (طٰہٰ: ۶۳) لیکن جلد ہی ان جادوگروں پر یہ حقیقت کھل گئی کہ حضرت موسیٰؑ ساحری کا کرتب نہیں دکھا رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے معجزات پیش فرما رہے ہیں۔ وہ آپ پر کھل کر ایمان لے آئے۔ اس پر فرعون طیش میں آ گیا اور انہیں ہاتھ پیر کاٹ کر مثلہ کرنے اور سولی پر چڑھانے کی دھمکی دی، لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی (طٰہٰ:۶۵-۷۳) کہا جاتا ہے کہ سولی دینے کا رواج اسی سے شروع ہوا۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو تبدیلِ دین اور فساد فی الارض کی کوشش قرار دے کر انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا اور کہا:

ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡہِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ○ (المومن:۲۶)

مجھے چھوڑو، موسیٰ کو قتل کر ڈالوں۔ وہ اپنے رب کو (مدد کے لیے) پکارے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا زمین میں فساد نہ برپا کر دے۔

ایک مردِ مومن نے فرعون اور اس کے درباریوں کو اس ناروا اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس کے انجامِ بد سے آگاہ کیا۔ (المومن:۲۸)

اس طرح حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو فرعون نے اپنے دین و مذہب، اپنی روایات اور اپنے اقتدار کے لیے ایک چیلنج تصور کیا۔ یہی بات اپنی قوم کو سمجھائی۔ قوم نے بھی اس سے اتفاق کیا اور اس کا ساتھ دیا۔ بنو اسرائیل پر اس کی سختی اور ظلم و زیادتی جاری رہی۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرعون کے سامنے مطالبہ رکھا کہ وہ بنو اسرائیل پر جو عذاب ڈھا رہا ہے اسے ختم کرے اور بنو اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے جانے کی اجازت دے۔ حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

فَاۡتِیٰہُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّکَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ وَلَا تُعَذِّبۡہُمۡ ؕ قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡہُدٰی ○ (طٰہٰ:۴۷)

اے موسیٰ اور ہارون! تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تمہارے رب کے فرستادہ ہیں۔ ہمارے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دو اور ان کو عذاب نہ دو۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں۔ سلامتی ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو اس کی اجازت نہ دی۔ حضرت موسیٰؑ اللہ واحد کی بندگی اور اطاعت کی جو دعوت دے رہے تھے وہ بڑی مدلل اور مستحکم تھی۔ دلائل کے میدان میں فرعون انہیں شکست نہ دے سکا، اس وجہ سے خود فرعون کی قوم کے بعض نیک طبع افراد بھی حضرت موسیٰؑ پر ایمان لا رہے تھے۔ اس نے ان سب کو تشدد اور ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ نے اس طویل دورِ شدائد اور سخت کشمکش کے ماحول میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرنے اور اس سے استعانت کی ہدایت فرمائی۔ قوم کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ فرعون کی حکومت اور اس کے اقتدار سے ہراساں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ آج ہے، کل ختم ہو سکتا ہے۔ تمہاری مظلومی بھی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (الاعراف: ۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ بے شک زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور (بہتر) انجام متقیوں کے لیے ہے۔

فرعون کی سختی اور جور و تشدد پر آپ نے قوم سے کہا کہ وہ اللہ پر اعتماد اور توکل کا مظاہرہ کرے۔ یہی دین و ایمان کا تقاضا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰی يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○ (یونس: ۸۴)

موسیٰ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اس پر توکل اور بھروسہ رکھو۔ اگر تم فرماں بردار ہو۔

اس کے نتیجے میں قوم اللہ کی طرف متوجہ ہوئی:

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (یونس: ۸۵، ۸۶)

پس انھوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں ظالم قوم کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے کافر قوم سے نجات دے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم ہوا کہ بنو اسرائیل کے لیے چند مکانات مخصوص کر دیں، جن میں وہ نماز باجماعت کا اہتمام کریں اور وہ پوری قوم کا مرکز ہوں (یونس:۸۷) ان مکانات کی حیثیت مساجد کی تھی۔ یہ ان کی شیرازہ بندی کی تدبیر تھی۔ اسی سے انہیں بکھرنے اور منتشر ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ بالآخر وہ مرحلہ آیا جب کہ حضرت موسیٰؑ ایک خاص منصوبے کے تحت اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے، بحرِ قلزم، جسے Red Sea کہا جاتا ہے، کے پاس پہنچے۔ اللہ کے حکم سے اپنا عصا اس پر مارا اور سمندر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ساتھ سمندر پار کر گئے۔ فرعون اور اس کی قوم نے آپ کا تعاقب کیا۔ وہ درمیان ہی میں تھے کہ سمندر کے دونوں پاٹ مل گئے اور وہ اس میں غرق ہو گئے۔ (البقرۃ:۵۰، الشعراء:۵۷-۶۴)

حضرت موسیٰؑ جب تک مصر میں رہے، اپنی قوم کی اصلاح و تربیت کے لیے جو اقدامات ممکن تھے، سب کیے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے احکام کی اطاعت اور اس کے دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کی اور جب حکم ہوا پوری قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے۔ لیکن مملکتِ فرعون میں رہتے ہوئے فرعون سے جہاد کا فیصلہ نہیں کیا اور اس کے لیے کسی قسم کی فوجی اور عسکری تیاری کا ذکر بھی ہمیں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک غیر اسلامی ملک میں اس کے مواقع اور حالات نہیں تھے، اس لیے وہ اس کے مکلّف بھی نہیں تھے۔

بعد کے ادوار میں بنو اسرائیل نے اللہ کے حکم سے جنگیں کیں۔ ان کا ذکر قرآن میں ہے۔ یہ جنگیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے لڑی گئی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ

یہی صورتِ حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ بعثت کے بعد آپ مکہ میں تیرہ (۱۳) سال رہے۔ اس مدت میں آپ کو اور آپ کے اصحاب کو سخت ترین حالات

سے گزرنا پڑا۔ طنز و تعریض، تحقیر و تذلیل، ذہنی اذیت، قید و بند، زد و کوب، قتل، معاشی اور معاشرتی مقاطعہ، سب کچھ پیش آیا۔ بہت سے اصحاب نے آپ کے مشورے سے ایک سے دو بار حبشہ ہجرت کی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازشیں کی جانے لگیں، آپ کو ہم درد افراد اور قبائل سے مدد کی درخواست کرنی پڑی۔ بعض اوقات یہ مدد حاصل بھی ہوئی۔ اس پوری مدت میں آپ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرنے، دین پر مضبوطی سے قائم رہنے، کارِ دعوت جاری رکھنے، اعلیٰ اخلاق اختیار کرنے، ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے، عفو و درگزر سے کام لینے، صبر و ثبات اور استقامت کا ثبوت دینے اور جلد بازی سے احتراز کرنے کی تعلیم و تلقین کی جاتی رہی۔ اس کو کلیدِ فتح و نصرت قرار دیا گیا۔ یہاں صرف ایک حوالہ پیش کیا جا رہا ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ○ (الروم:۶۰)

پس صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے، تمہیں ہرگز ہلکا نہ پائیں۔

مکہ میں شروع سے آخر تک اسی رخ سے تربیت ہوتی رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تلوار اٹھانے اور جہاد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں جب ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو جہاد کی اجازت ان الفاظ میں دی گئی:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ○ (الحج:۳۹)

وہ لوگ جن سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں بھی جنگ کی اجازت دی گئی اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھتا ہے۔

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جہاد کی اوّلین اجازت ہجرت کے بعد ملی تھی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

أَوَّلُ مَا شُرِعَ الْجِهَادُ بَعْدَ الْهِجْرَةِ النَّبَوِيَّةِ إِلَى الْمَدِينَةِ اتِّفَاقًا[1]

مدینہ ہجرت نبویؐ کے بعد پہلی بار جہاد مشروع ہوا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۶/ ۱۲۰

مکہ اور مدینہ میں اس فرق کے دو خاص اسباب ہیں: ایک یہ کہ جہاد کے لیے سیاسی قوت واقتدار اور باقاعدہ عسکری نظام کی ضرورت ہے۔ یہ ریاست ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ مکہ میں مسلمان ایک غیر اسلامی اقتدار کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں سیاسی اقتدار اور قوت حاصل نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ریاست کے اندر تلوار اٹھانے کا لازمی نتیجہ خانہ جنگی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس کی لپیٹ میں صرف سیاسی اور فوجی قوت ہی نہیں، بلکہ شہری آبادی بھی آئے گی، ناحق خوں ریزی ہوگی، بے گناہ اور معصوم افراد مارے جائیں گے۔ عام انسانی حقوق پامال ہوں گے اور ان حدود وقیود کی پابندی نہ ہوسکے گی، جن کی پابندی کا اسلام حالتِ جنگ میں بھی حکم دیتا ہے۔ یہ فساد فی الارض ہے۔ اس سے کوئی اعلیٰ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

ضمیمہ

جہاد کے موضوع پر دو اہم تصانیف

۱۔ الجہاد فی الاسلام

جہاد کے موضوع پر اردو میں پہلی مفصل اور جامع تصنیف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'الجہاد فی الاسلام' ہے۔ اس میں جہاد کے مقصد، اس کے قوانینِ صلح و جنگ کی اس طرح تشریح کی گئی ہے کہ اسلام کا پورا نظامِ سیاست زیر بحث آ گیا ہے۔ اس کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ایک باب میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے مقاصد اور مابعد جنگ کے رویوں میں عرب جاہلیت کے غیر مہذب قبائل اور روم و ایران جیسی مہذب قوموں کے درمیان جوہری فرق نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے قوانینِ صلح و جنگ میں جو اصلاحات کیں ان کا تفصیل سے تذکرہ ہے۔ ایک باب کا عنوان ہے 'جنگ دوسرے مذاہب میں'۔ اس میں ہندومت، یہودیت، بودھ مت اور مسیحیت کی تعلیمات کا تجزیہ ہے۔ اسی میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی ہوگئی ہے۔ یہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آخری باب 'جنگ تہذیب جدید میں' کے عنوان سے ہے، جس سے جنگ میں مغربی اقوام کی خودغرضی اور بے اصولی واقعات کی روشنی میں سامنے آتی ہے۔

یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں پہلی بار دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ ۱۹۷۴ء

میں مصنف کی نظر ثانی کے بعد اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس چوالیس برس کے عرصہ میں جنگی حالات میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اب تو اس سے کہیں زیادہ تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ مولانا نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی فقہاء کرام نے اپنے دور کے حالات میں جو تشریح کی ہے اسے پیش نظر رکھ کر فقہ کی جدید کتابُ الجہاد مرتب کرنا فقہاء عصر کا کام ہے۔ (ص: ۳۲۴)

یہ کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵ سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ یہی میرے پیش نظر ہے۔

مولانا مودودیؒ نے جہاد کے موضوع پر تفہیم القرآن اور اپنی بعض دوسری تصنیفات میں بھی بحث کی ہے۔ مولانا کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان سب کو سامنے رکھنا ہوگا۔

۲-فقہ الجہاد

جہاد کے موضوع پر عربی میں سب سے مفصل کتاب علامہ یوسف القرضاوی کی 'فقہ الجہاد: دراسۃ مقارنۃ لأحکامہ وفلسفتہ فی ضوء القرآن والسنۃ' ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک دائرۃ المعارف ہے۔ اس میں قرآن ،حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں جہاد کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جہاد کے شرائط، جہاد اور قتال، جہاد اور ارہاب، دفاعی اور اقدامی جہاد، صلح وجنگ، اہل ذمہ کے حقوق، جزیہ کا حکم، دار السلام اور دار الحرب، قیدیوں کے احکام، موجودہ حالات اور حکم جہاد، اندرون ملک قتال کا حکم، مسلم ممالک کے درمیان جنگ، جہاد علمی وفکری اور دور حاضر کے تقاضے، جہاد پر مغرب کے اعتراضات جیسے بہت سے موضوعات زیر بحث آ گئے ہیں۔ ان میں اسلامی مفکرین کی آراء کے درمیان تفصیلی محاکمہ بھی ہے۔ آخر میں بعض ضمیمے شامل ہیں۔

علامہ قرضاوی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بہت ہی شرح وبسط سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ جہاد سے متعلق ہمارے علمی ذخیرے میں یہ ایک قیمتی اضافہ ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ کسی بھی مصنف یا محقق کی ہر بات سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ اس سے اختلاف کی گنجائش بہر حال رہتی ہے۔ اس کتاب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن مارچ ۲۰۱۰ء میں دو جلدوں میں مکتبۂ وھبہ قاہرہ سے شائع ہوا ہے۔ دونوں جلدوں کے صفحات کی تعداد ۱۶۴۶ ہے۔

کتابیات

کتاب میں قرآن مجید کی آیات کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ دوسرے ماخذ کے حوالے حواشی میں ہیں۔ وہاں ان کے مصنّفین، مطابع اور سنینِ طباعت کی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے اس کی تفصیل دی جارہی ہے، تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔ البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب وابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابع کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

قرآن مجید: منزل من اللہ

تفسیر

۱- آلوسی، شہاب الدین السید محمود البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر۔

۲- ابن جریر، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دارالعرفۃ بیروت، لبنان ۱۹۷۸ء (طبع قدیم)۔

۳- ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، دارالمعرفۃ بیروت، لبنان ۱۹۶۹ء

۴- ابوحیان اندلسی، محمد بن یوسف بن علی نحوی الاندلسی الغرناطی، البحر المحیط فی التفسیر۔

۵- بغوی، ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء، معالم التنزیل (مع تفسیر الخازن)۔

۶- بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۸۸۔

۷- جلالین، سیوطی: تفسیر الجلالین، دارالمعرفۃ، لبنان ۱۹۸۳ء۔

۸- خازن، علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی لباب التاویل فی معانی التنزیل،

دارالکتب العلمیۃ ،لبنان ۱۹۹۵ء۔

۹- رازی، فخرالدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، دارالکتب العلمیۃ ،لبنان، ۱۹۹۰ء۔

۱۰- رشید رضا، تفسیر القرآن الکریم (تفسیر المنار) دارالمنار، مصر، ۱۳۶۵ھ۔

۱۱- زمخشری، ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر، ۱۹۷۳ء۔

۱۲- قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، دارالکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، طبع ۱۹۸۸ء۔

احکام القرآن

۱۳- ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ الاشبیلی المالکی، احکام القرآن، دارالمعرفۃ ،لبنان، طبع جدید۔

۱۴- جصاص، ابوبکر احمد بن علی الرازی الحنفی، احکام القرآن، المطبعۃ البہیۃ ،مصر، ۱۳۴۷ھ۔

حدیث

۱۵- ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ القزوینی، سنن ابن ماجہ۔

۱۶- ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد۔

۱۷- احمد، ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی الذہلی، المسند۔

۱۸- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسننہ وایامہ۔

۱۹- بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین بن علی، السنن الکبریٰ۔

۲۰- ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع الترمذی۔

۲۱- خطیب التبریزی، مشکوۃ المصابیح۔

۲۲- زیلعی، جمال الدین ابومحمد عبداللہ الحنفی، نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ مع الہدایۃ، دارالکتب العلمیۃ ،لبنان ۱۹۹۶ء۔

۲۳- مسلم بن حجاج القشیری النیسابوری، صحیح مسلم۔

۲۴- نسائی، ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب بن علی، سنن النسائی۔

شروح حدیث

۲۵- ابن حجر، الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، المکتبۃ التجاریۃ، بیروت ۱۹۹۶ء۔

۲۶- خطابی، ابوسلیمان احمد بن محمد، معالم السنن، المطبعۃ العلمیۃ حلب، ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء۔

۲۷- شوکانی، محمد بن علی بن محمد، نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی قاہرہ، مصر ۱۹۷۱ء۔

۲۸- محمد ناصر الدین بن نوح نجاتی الالبانی، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ۔

۲۹- ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، دار الفکر بیروت ۱۹۹۴ء۔

۳۰- نووی، محی الدین ابوزکریا یحییٰ، شرح مسلم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۵ء۔

فقہ، فتاویٰ اور علم کلام

۳۱- ابن تیمیہ، تقی الدین ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ نمیری، الفتاویٰ، دار العربیۃ، بیروت لبنان ۱۳۹۸ھ۔

۳۲- دردیر، ابوالبرکات احمد بن محمد بن احمد، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب امام مالک، دار المعارف، مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۴ء۔

۳۳- ابن رشد، ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد القرطبی، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، تحقیق و تعلیق: شیخ علی محمد معوض، شیخ عادل احمد عبدالودود، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۷ء۔

۳۴- ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین الدمشقی الحنفی، رد المحتار علی الدر المختار، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۴ء۔

۳۵- ابن قدامہ، ابومحمد عبداللہ بن احمد بن احمد بن محمد ابن قدامہ، المغنی، طبع ہجر القاہرۃ، ۱۹۹۲ء۔

۳۶- ابن الہمام، محمد بن عبدالواحد السیواسی الحنفی، فتح القدیر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ مصر، ۱۳۱۵ھ۔

۳۷- تفتازانی، سعد الدین، شرح المقاصد، عالم الکتب، بیروت ۱۹۸۹ء۔

۳۸- سرخسی،محمد بن احمد بن ابی سہل شمس الائمۃ السرخسی، المبسوط، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۳ء۔

۳۹- صاوی،بلغۃ السالک لاقرب المسالک علی الشرح الصغیر للقطب سیدی احمد الدردیر۔

۴۰- قرضاوی، یوسف القرضاوی۔ فقہ الجہاد: دراسۃ مقارنۃ لاحکامہ وفلسفتہ فی ضوء القرآن والسنۃ۔طبع ثالث،مکتبہ وھبہ۔قاہرہ ۲۰۱۰ء۔

۴۱- کاسانی،علاء الدین ابوبکر بن مسعود بن احمد الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، دارالفکر، بیروت،لبنان ۱۹۹۶ء۔

۴۲- مرغینانی، برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر،الہدایہ شرح البدایۃ (مختصر القدوری)

سیرت وتاریخ وتذکرہ

۴۳- ابن اثیر،عزالدین ابوالحسن علی بن محمد الجزری، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ،دارالشعب القاہرۃ،۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء۔

۴۴- ابن حجر،الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی،الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ،ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، القاہرۃ،مصر۔

۴۵- ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد القرطبی المالکی، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب برحاشیہ الاصابۃ۔

۴۶- ابن قیم الجوزیۃ،زادالمعاد فی ھدی خیر العباد،دارعالم الفوائد للنشر والتوزیع الریاض۔ ۱۴۳۹ھ/۲۰۱۸ء۔

لغت

۴۷- ابن اثیر،النہایۃ فی غریب الحدیث،داراحیاء التراث العربی بیروت۔

۴۸- ابن منظور، لسان العرب۔

۴۹- اصفہانی، ابوالقاسم الحسین بن محمد بن الفضل الراغب، المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ المیمنۃ مصر، ۱۳۲۴ھ۔

۵۰- فیوزآبادی، مجدالدین محمد، القاموس المحیط،دارالفکر بیروت لبنان ۱۹۹۵ء۔

مصنف کی وہ مطبوعات جن کا حوالہ کتاب میں آیا ہے:

۱- غیر مسلموں سے تعلقات اوران کے حقوق
۲- تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث
۳- انفاق فی سبیل اللہ
۴- صحت ومرض اوراسلامی تعلیمات
۵- دورِحاضر میں اسلام کے علمی تقاضے
۶- سبیل رب۔دعوت الی اللہ کا راستہ

ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی-۲۵
